ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابویحییٰ

فروری ۲۰۱۹

www.inzaar.pk

February 2019
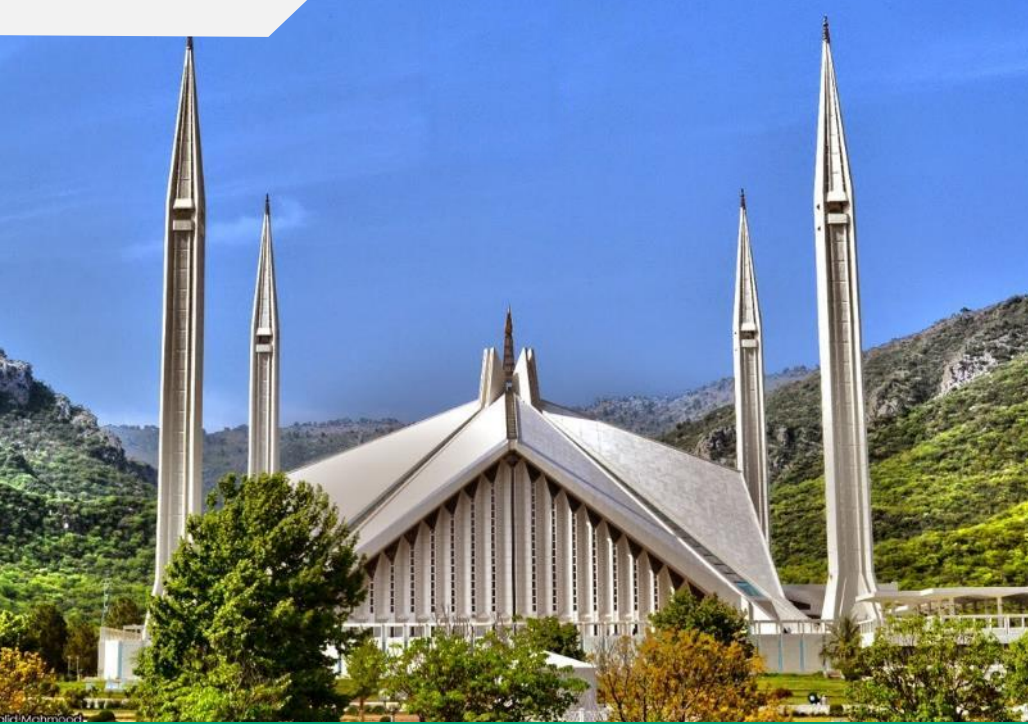
جو خدا کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے

خدا بھی اسے سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: facebook.com/inzaartheorg

Join us on YouTube youtube.com/inzaar-global

WhatsApp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from WhatsApp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to **info@inzaar.org** and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD

ماہنامہ
اِنذار
فروری 2019ء جمادی الاول/جمادی الثانی 1440ھ
جلد 7 شمارہ 2

ابویحییٰ کے قلم سے

مدیر:
ابویحییٰ ریحان احمد یوسفی

سرکولیشن مینیجر:
غازی عالمگیر

معاون مدیر:
عابد علی، بنت فاطمہ، سحر شاہ

معاونین:
محمد شفیق، محمود مرزا

فی شمارہ ـــــ 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.pk

بولنا اور چپ رہنا

بولنے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ سورہ رحمان کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اسے جس اہتمام سے تمام نعمتوں سے پہلے گنوایا ہے، اس سے اس نعمت کی عظمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ تاہم انسان گویائی کی یہ صلاحیت درست استعمال نہ کرے تو یہی نعمت اس کے لیے آخرت میں سخت گرفت کا سبب بن جائے گی۔ اسی لیے حضور نے متعدد احادیث میں زبان پر قابو رکھنے اور غیر ضروری بولنے کے بجائے چپ رہنے کی تلقین کی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے سماج میں اس پہلو سے لوگوں کی کوئی تربیت نہیں ہوتی۔ یہاں ہر شخص بولنے کو سب سے بڑا کام سمجھتا ہے۔ دور جدید میں اس بولنے کے عمل کو سوشل میڈیا نے نئے اور طاقتور ذرائع مہیا کردیے ہیں۔ اب ہر شخص سوشل میڈیا پر بے تکان بولتا اور لکھتا رہتا ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ بولنا ایک ذمہ داری ہے۔

ایسے میں ضرورت ہے کہ لوگوں کو چپ رہنا سکھایا جائے۔ لوگوں کو بتایا جائے کہ چپ رہنا کوئی سادہ عمل نہیں۔ بولنے کے لیے گلے کی طاقت چاہیے اور چپ رہنے کے لیے دماغ کی صلاحیت ضروری ہے۔ خاموشی سوچنے کی اس صلاحیت کو استعمال کرنے کا عمل ہے جو انسان کا سب سے بڑا شرف ہے۔ جب لوگ سوچتے نہیں اور بولتے رہتے ہیں تو ان کا بولنا تقابل، تجزیہ، تحلیل اور خود احتسابی جیسی اعلیٰ صفات سے خالی ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ اس بولنے میں بہت سے گناہ جیسے غیبت، بہتان، سنی سنائی بات کو آگے پہنچانا وغیرہ شامل ہوجاتے ہیں۔

بولنے کے اس دور میں لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کے ہر ہر لفظ کا احتساب ہوگا۔ اس لیے کم بولنے کا مطلب اپنے احتساب کو کم کرنا ہے اور زیادہ بولنے کا مطلب اپنے احتساب کو بڑھانا ہے۔ اور وہ شخص احمق ہے جو روزِ قیامت خود ہی اپنے احتساب میں اضافہ کروائے۔

منکر جب معروف بن جائے

ایک فیملی میں کسی بچی کا رشتہ آیا۔لڑکا سرکاری ملازم تھا۔تیس چالیس ہزار ماہانہ تنخواہ تھی، مگر خرچے لاکھوں کے تھے۔اس کا سبب رشوت کی کمائی تھی۔ رشتہ کی ابتدائی بات چیت میں بھی وہ نوجوان اوراس کے گھر والے رشوت اور کرپشن کی آمدنی کا اس طرح ذکر کرتے رہے جیسے کہ یہ کسی جائز کاروبار سے آمدنی کا ذکر کررہے ہوں۔

لڑکی والے بہت دیانتدار اور خدا کا خوف رکھنے والے تھے۔ دو تین ابتدائی ملاقاتوں میں جب یہ ذکر بار بار ہوا تو انھوں نے رشتہ ختم کرنے سے پہلے ایک دفعہ براہ راست لڑکے سے اس حوالے سے بات کرلی۔ اس پر لڑکے اوراس کی فیملی کی طرف سے سخت ردعمل آیا کہ یہ کون سا قابل اعتراض معاملہ ہے جس پر سوالات کیے جائیں۔ چنانچہ یہ رشتہ ختم ہوگیا۔

جو لوگ قرآن وحدیث سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ دین اس صورتحال کو ایک بہت بڑے عذاب سے پہلے کا پیش خیمہ سمجھتا ہے کہ کسی معاشرے میں لوگ منکر پر اتنے دلیر ہوجائیں کہ اس منکر کو معروف اور معروف کو منکر سمجھنے لگیں۔ رشوت اور کرپشن معمول کی چیز بن جائے اور اس پر سوال کرنے والے مجرم قرار پائیں۔

بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ اسی دور میں داخل ہوچکا ہے۔ تاہم ایک اچھی بات یہ ہے کہ اسی معاشرے میں کچھ لوگ پوری قوت سے اس بات پر قائم ہیں کہ وہ اس برائی کو برائی سمجھیں گے، چاہے ان کی شادی کے قابل بیٹی کا رشتہ ہی کیوں نہ ٹوٹ جائے۔

پاکستانی قوم کے مستقبل کا فیصلہ اگلے دو عشروں میں ہونے والا ہے۔ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ اس بنیاد پر کریں گے کہ معاشرہ مجموعی طور پر کس طرح کے لوگوں کی بات کو سنتا ہے۔ ہماری بچت کا ایک ہی راستہ ہے کہ معاشرہ اہل خیر کی بات سنے۔ ورنہ ایک کرپشن زدہ معاشرے کا انجام یہی ہوگا کہ وہ اپنی عیاشیوں سمیت زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔

آہ یہ چالاک انسان......

آہ یہ انسان......اسے کیسا عظیم موقع دیا گیا اور اس نے کتنی بے دردی سے اس موقع کو ضائع کر دیا۔ یہ کیسا عظیم نقصان ہے...... یہ کیسی بڑی محرومی ہے...... یہ کیسی عجیب بے حسی ہے...... یہ کیسی سنگین غلطی ہے۔ انسان کو جس روز اس کا احساس ہو گا وہ روئے گا، چیخے گا، چلائے گا۔ مگر افسوس اس کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔

اس انسان کو موقع دیا گیا تھا کہ وہ کائنات کی سب سے باکمال اور بے مثال ہستی کے آگے پورے شعور کے ساتھ سرِ تسلیم خم کر دے، مگر وہ اپنے تعصّبات، اپنی خواہشات اور اپنے حقیر مفادات سے اوپر نہ اٹھ سکا۔ انسان کو یہ موقع دیا گیا تھا کہ وہ ایک سراپا کرم مالک کا شکر گزار بن کر جیے، مگر اس نے اپنے لیے غفلت بھری زندگی کا انتخاب کیا۔ انسان کو یہ موقع دیا گیا تھا کہ وہ رب کائنات کی عظمت کے مقابلے میں اپنے مکمل عجز کو دریافت کرے اور اس کے حضور سراپا نیاز......سراپا اطاعت بن کر رہے، مگر وہ سرکشی اور تکبر کا شکار رہا۔

انسان بہت چالاک ہے۔ یہ چاہتا غیر اللہ کو ہے، مگر رسمی طور پر خدا کا نام لیتا ہے۔ وہ جیتا اپنے تعصّبات میں ہے، مگر اپنی بات کو اصولی بات بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ پیروی اپنی خواہش کی کرتا ہے، مگر خود کو نظریاتی آدمی بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ آخرت کے لیے کوئی قربانی دینے کو تیار نہیں، مگر سفارش اور جھوٹی امیدوں کی بنا پر خود کو جنت کا حقدار سمجھتا ہے۔

انسان کو اس کی چالاکی بہت مہنگی پڑے گی۔ بہت جلد عالم کا پروردگار اسے اپنے حضور طلب کر کے اس سے پوچھے گا تو نے حق پر اپنے تعصب کو کیوں ترجیح دی؟ دلیل پر جذباتی باتوں کو کیوں ترجیح دی؟ آخرت پر دنیا کو کیوں ترجیح دی؟ مجھ پر غیر کو کیوں ترجیح دی؟ اُس روز یہ انسان جان لے گا کہ کس پستی کی خاطر اس نے فردوس بریں میں خدا کے ابدی پڑوس کی بلندی کو گنوا دیا۔

نمرود اور آج کے منکرین خدا

پچھلے دنوں مجھ سے ایک سوال کیا گیا۔ اس سوال کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے قصے سے تھا۔ یہ سوال اصلاً نیاز فتح پوری (1882-1966) نے اٹھایا تھا۔ سوال کے مطابق حضرت ابراہیم نے نمرود کو چیلنج دیا تھا کہ میرا خدا سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے۔ تو خدا ہے تو سورج کو مغرب سے نکال کر دکھا۔ اس موقع پر اگر نمرود کہہ دیتا کہ میں سورج کو مشرق سے نکالتا ہوں۔ تو اپنے خدا سے کہہ کہ وہ سورج کو مغرب سے نکالے تو حضرت ابراہیم کے پاس کوئی جواب نہ رہ جاتا۔ یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات نقل کر کے سائل نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ ان سوالات نے ان کے اندر اپنے عقیدے کے بارے میں بے چینی پیدا کر دی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے سوالات کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ایمان کو ایک آبائی مذہب کے طور پر اختیار کرتے ہیں، سوال کا جواب تلاش کرنے کے عمل میں ان کا ایمان ماں باپ کے مذہب کے بجائے اس حقیقی مذہب پر قائم ہو جاتا ہے جو اللہ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دورِ جدید کے سوالات کا مقابلہ صرف قرآن مجید کر سکتا ہے جو آخری اور ابدی کتاب ہے۔ مثلاً اسی سوال کو لے لیجیے۔ اس سوال میں جو منطق کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح نمرود نے سورج دیوتا کا اوتار ہونے کے ناطے اپنی خدائی کا دعویٰ کیا تھا، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ نہ سورج دیوتا ہے نہ نمرود اس کا اوتار تھا، اسی طرح حضرت ابراہیم کا دعویٰ نبوت بھی بس ایک دعویٰ ہی تھا۔ نہ وہ نبی تھے نہ خدا کوئی ہستی ہے۔

اس مفروضہ منطق پر یہ سوال ٹھیک ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم واقعی خالق کائنات کے پیغمبر تھے۔ پیغمبر جب آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ عام دستور کے برخلاف عالم اسباب میں وہ واقعات

ظہور پذیر کرنا شروع کر دیتے ہیں جن کو عرف عام میں معجزات کہا جاتا ہے۔اس لیے حقیقت یہ ہے کہ نمرود یہ مطالبہ کرتا تو یہ بات یقینی تھی کہ اللہ تعالیٰ سورج کو مغرب سے نکال کر دکھا دیتے۔

تاہم نمرود نے یہ مطالبہ نہیں کیا۔اس کا سبب یہ تھا کہ وہ بے وقوف نہ تھا۔وہ جانتا تھا کہ اس کے پیدا ہونے سے قبل بھی سورج مشرق سے نکلتا تھا اور اس کے مرنے کے بعد بھی سورج مشرق ہی سے نکلے گا۔اس لیے وہ یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن ہی میں نہیں تھا کہ میں سورج کو مشرق سے نکالتا ہوں۔مزید براں یہ کہ وہ خاموش ہونے کے بجائے اگر حضرت ابراہیم کو یہ چیلنج دیتا تو صرف اسی قیمت پر کہ وہ عملی طور پر یہ مان لیتا کہ میں تو خدا نہیں ہوں، اب تم اپنے خدا کا خدا ہونا ثابت کرو۔حضرت ابراہیم اس کا مطالبہ پورا کرتے یا نہ کرتے، مگر یہ بات سب پر واضح ہو جاتی کہ کم از کم نمرود خدا نہیں ہے۔اس کا دعویٰ خدائی باطل ہے۔

چنانچہ نمرود نے اس بے وقوفی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے وہی کیا جو اس جیسے چالاک سیاسی لیڈر کو کرنا چاہیے تھا۔اس نے بتوں کی توہین کے جرم میں حضرت ابراہیم کو زندہ آگ میں پھینکنے کا حکم دے دیا۔جس کے بعد وہ معجزہ کر دیا گیا جو کسی پیغمبر کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ عالم اسباب میں مداخلت کر کے رونما کرتے ہیں۔جس آگ میں حضرت ابراہیم کو پھینکا گیا وہ آگ انھیں جلانے کے بجائے ان پر ٹھنڈی اور سلامتی والی بن گئی۔

یہ معجزہ بتاتا ہے کہ نمرود اگر فرمائش کرتا تو آگ کی تاثیر کو الٹ دینے والا خدا سورج کو بھی مغرب سے نکال کر دکھا دیتا۔مگر اس طرح خدا کو علانیہ دیکھنے کا مطالبہ کرنے والے منکرین خدا کو یاد رکھنا چاہیے کہ پھر ان کے لیے معافی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔معافی صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو سنجیدگی سے سچائی کو تلاش کرتے ہیں اور غلطی سے ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔مگر جیسے ہی صحیح بات سامنے آتی ہے حق کا اعتراف کر کے سجدے میں گر جاتے ہیں۔

بامقصد زندگی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بڑی غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔مگر اکثر حالات میں یہ صلاحیتیں دبی رہتی ہیں۔ یہ صلاحیتیں اس وقت پوری طرح اجاگر ہوتی ہیں جب انسان کسی مشکل میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ایسے میں انسان اپنی سو فیصد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا اور مشکل سے مشکل حالات کا سامنا بڑے حوصلے سے کرلیتا ہے۔تاہم جیسے ہی مشکل حالات گزر جاتے ہیں انسان دوبارہ معمولی انسان بن جاتا ہے۔

تاہم ایک دوسرا ذریعہ ایسا ہے جو نہ صرف انسان کی صلاحیتوں کو پوری طرح بیدار کرتا ہے بلکہ مستقل طور پر انسان کو ایک غیر معمولی انسان بنادیتا ہے۔ یہ دوسرا موقع وہ ہوتا ہے جب انسان اپنی زندگی کا کوئی بلند تر مقصد طے کرلیتا ہے۔مقصد چھوٹا ہو یا بڑا جب انسان کا دل ودماغ پوری طرح اس پر مطمئن ہوجائے تو انسان کو غیر معمولی بنادیتا ہے۔

ایسا انسان اپنے مقصد کے لیے ہر مشکل جھیلتا، ہر مشقت اٹھاتا اور ہر طرح کے حالات سے ٹکراجاتا ہے۔وہ ناممکن کو ممکن بنادیتا ہے۔ وہ مشکل کو آسان کردیتا ہے۔ وہ ناقابل حصول کو قابل حصول بنادیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کا مقصد اس سے کرواتا ہے۔اس کی سادہ ترین مثال طلبا کا زمانہ امتحان ہے جس میں تمام طالب علم غیر معمولی محنت کرتے ہیں اور اپنی اپنی صلاحیت کے لحاظ سے بہتر سے بہتر نتیجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چنانچہ کوئی شخص اگر اپنی تمام صلاحیتوں کو بیدار کرنا چاہے تو اسے ایک بامقصد زندگی گزارنی چاہیے۔ یہ مقصد اس کے حالات کے لحاظ سے کچھ بھی ہوسکتا ہے،لیکن سب سے بہتر مقصد جنت کی منزل اور اس تک پہنچنے کے درست راستے کی تلاش ہے۔

جنت کو اپنا مقصد بنانے کے دو فائدے ہیں جو کسی اور طرح سے حاصل نہیں ہوسکتے۔ایک

یہ کہ یہی وہ مقصد ہے جسے لے کر ہر انسان دراصل اس دنیا میں آیا ہے۔ ہمارے اندر جتنی بھی صلاحیتیں ہیں وہ اصلاً اس لیے رکھی گئی ہیں کہ ہم جنت کی مشکل مگر اعلیٰ ترین کامیابی کو حاصل کرسکیں۔ جس وقت ہم جنت کو اپنا مقصد بناتے ہیں تو ہم اپنے وجود کے ظاہر و باطن، دل و دماغ، روح و جسم سب کو پوری طرح فعال کردیتے ہیں۔

جنت کو منزل بنانے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس منزل کا جو راستہ قرآن مجید نے بیان کیا ہے اور جسے عرف عام میں ایمان و اخلاق کی دعوت کہتے ہیں، اس راستے کی تلاش اور اس پر چلنے کا عمل انسان کے اندر سے اس کی تمام خرابیاں خود بخود دور کردیتا ہے۔ جنت کے راستے پر کوئی متعصب، مفاد پرست، خود پسند، نامعقول اور بداخلاق انسان نہیں چل سکتا۔ یہی وہ خرابیاں ہیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جہنم بنادیتی ہیں۔ چنانچہ ایک بندہ مومن جب قرآن کی بیان کردہ صراط مستقیم یعنی ایمان و اخلاق کے تقاضوں کو اختیار کرنا شروع کرتا ہے تو معاشرے میں ایک اعلیٰ انسان کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ اعلیٰ انسان جہاں بھی ہوں، بندگان خدا کے لیے رحمت بن کر رہتے ہیں۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو جنت کی کامیابی کا جو مقصد دے کر بھیجا تھا، بدقسمتی سے دنیا کی کشش نے اس کا رخ مادی اور فانی کامیابیوں اور دنیا کی رنگینیوں کی طرف کردیا ہے۔ آج کا انسان دنیوی مقاصد کے لیے جان لڑادیتا ہے، مگر آخرت کے اس عظیم مقصد سے غافل ہے جس کے لیے اسے تمام صلاحیتیں دی گئی تھیں۔ دنیا کو مقصد بنانے کے نتیجے میں پست سے پست تر انسان سماج میں بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ یہ انسان جہاں ہوتے ہیں، بندگان خدا کے لیے ایک مصیبت بن کر رہتے ہیں۔ ایسے میں انسان کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اسے آخرت کے مقصد کی یاددہانی کرائی جائے۔ یہی کرنے کا سب سے بڑا کام ہے۔

رزق اور قرآن مجید

رزق کے حوالے سے ہمارے ہاں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ خاص کر یہ غلط فہمی تو بہت عام ہے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرا بیٹھا رہے تب بھی اس کا رزق اس تک ضرور پہنچے گا۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اس حوالے سے قرآن مجید کا نقطہ نظر واضح کر دیا جائے۔

قرآن مجید اس دنیا میں ملنے والے مادی رزق کو تین پہلوؤں سے زیر بحث لایا ہے۔ ان میں سے پہلا دعوت عبادت رب اور شرک کے پس منظر میں زیر بحث آیا ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید کے تمام بیانات یہ واضح کرتے ہیں کہ رزق دینے والی ہستی صرف اللہ ہی کی ہے۔ چنانچہ اسی کی عبادت اور شکر گزاری ہونی چاہیے۔ غیر اللہ کے ہاتھ میں نہ کوئی رزق ہے اور نہ اللہ کے عطا کردہ رزق پر غیر اللہ کا نام لیا جا سکتا ہے اور نہ کسی اور قسم کی مشرکانہ بدعت کا ارتکاب کیا جا سکتا ہے۔

رزق کا دوسرا پہلو قرآن مجید میں انفاق پر ابھارنے کے ضمن میں بیان ہوا ہے۔ ایسی تمام آیات میں اللہ تعالیٰ بار بار لوگوں کو یہ توجہ دلاتے ہیں کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ ان کے رب ہی کا عطا کردہ رزق ہے۔ اس لیے جب وہ اس کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اپنے پاس سے کسی کو نہیں دے رہے ہوتے بلکہ صرف وہ ذریعہ بنتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ اس کا اجر گرچہ انھیں ملے گا مگر یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رہے کہ دینے والی ہستی اللہ ہی کی ہے۔

یہ بات جس طرح امیروں سے مخاطب ہو کر کہی گئی ہے، اسی طرح غریبوں کو رزق کے باب میں یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ رزق کے معاملے میں اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ رزق میں تنگی کے خوف سے ایمان و اخلاق کے کسی تقاضے کو پورا کرنے سے نہ تو پیچھے ہٹنا چاہیے اور نہ اس حوالے

سے کسی حرام کا ارتکاب کرنا چاہیے۔ اللہ ہی رزق دینے والا ہے۔ چنانچہ اسی پر بھروسہ کرکے اس کے احکام پر عمل کرنا چاہیے اور نافرمانی سے بچنا چاہیے۔

اس حوالے سے تیسری اور آخری بات وہ ہے جو کفار کے اس تکبر کے پس منظر میں کہی گئی جس کی بنا پر انھوں نے دعوت حق کا انکار کر دیا تھا۔ انھیں اپنی دولت کا بہت زعم تھا۔ وہ اسے اپنی محنت اور صلاحیت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ اپنی بڑائی کے احساس میں وہ دعوت حق کو جھٹلاتے اور غریبوں پر خرچ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ یہی وہ پس منظر ہے جس میں قرآن بار بار یہ توجہ دلاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے جو اپنی حکمت کے تحت جس کو چاہے زیادہ رزق دے اور جس کا رزق چاہے تنگ کر دے۔ چاہے تو غریب کو امیر کر دے اور چاہے تو امیر کو غربت کا مزہ چکھا دے۔ چنانچہ کسی کو رزق کی اس تقسیم کی بنیاد پر جو سرتاسر اللہ کا فیصلہ ہے، تکبر کا حق حاصل نہیں ہے۔

یہ رزق کے باب میں قرآن مجید کے بیانات کا خلاصہ ہے۔ رہی یہ بات کہ اسلام کوئی خاص معاشی نظام دیتا ہے یا تقسیم رزق کا کوئی فارمولا طے کرتا ہے یا کسی فرد کو بغیر جدوجہد کے رزق عطا کرنے کا کوئی وعدہ کرتا ہے، اس طرح کی چیزیں قرآن مجید میں زیر بحث آئی ہیں اور نہ یہ اس کا موضوع ہیں۔ ان سارے معاملات میں اصول یہ ہے کہ انسانی فطرت اور عقل اس کی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ انسان کو انھی کی پیروی کرنی چاہیے۔ اگر کوئی مسلمہ فطری اور عقلی اصول کی خلاف ورزی کرے گا تو خود ہی اس کے نتائج بھگتے گا۔

اس کو ایک سادہ مثال سے یوں سمجھیں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ یہ کہتے ہیں کہ وہ جس کو چاہیں بیٹیاں دیں، جس کو چاہیں بیٹے دیں جس کو چاہیں دونوں ملا کر عطا کریں اور جس کو چاہیں کچھ نہ دیں، (الشوریٰ 42:49-50)۔ اب قرآن مجید کے اس بیان کو لے کر کوئی شخص یہ کہنا شروع کر دے کہ اللہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور میں بغیر نکاح کے بندھن کے ہی اولاد پالوں گا تو یہ

نری حماقت ہوگی۔ دینے کو تو اللہ نے حضرت مریم کو ایسے ہی اولاد دے دی تھی۔ مگر ان کا قانون فطرت یہی ہے کہ ایک مرد وعورت نکاح کے بندھن میں بندھیں گے، تعلق زن وشو قائم کریں گے، اس کے بعد ہی جا کر اللہ کی قدرت ظہور میں آئے گی۔ گویا پوری بات یہ ہوگی کہ یہ آیت نکاح اور تعلق زن وشو کے بعد کی صورتحال کو زیر بحث لا رہی ہے نہ کہ اس سے پہلے کی۔

ٹھیک اسی طرح رزق کے معاملے میں فطرت کا عمومی قانون یہی ہے کہ ایک شخص جدوجہد کرے گا تو اس کو رزق ملے گا۔ وہ اپنی جاب اور کاروبار میں اسی درجہ میں کامیاب ہوگا جس درجہ میں محنت، منصوبہ بندی اور دیگر معاشی اور کاروباری عوامل کا خیال رکھ کر معاشی عمل کو اختیار کرے گا۔ لیکن کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہے گا اور اللہ تعالیٰ ہی ہر طرح کا رزق اس کو دیتے رہیں گے تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ جس طرح کھانا کھانے کے لیے منہ کھولنا پڑتا ہے اسی طرح رزق کمانے کے لیے جدوجہد لازم ہے۔ یہی قانون فطرت ہے۔

تاہم انسانوں کی محنت کے بعد اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کس کی محنت اکارت جاتی ہے اور کس کی محنت ٹھکانے پر لگتی ہے۔ کس کو اس کی محنت سے کئی گنا بڑھا کر رزق دیا جاتا ہے اور کس کو تمام تر محنت کے باوجود نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ سب اللہ کی حکمت کے تحت ہوتا ہے۔ مگر ہوتا اسی وقت ہے جب انسان اپنے حصے کا کام کر دے۔

یہی معاملہ اجتماعی معاشی نظام کا ہے۔ اگر اس معاملے میں عقلی اور فطری قوانین کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا تو مسائل پیدا ہوں گے۔ ان مسائل کی ذمہ داری انسانوں پر عائد ہوگی۔ ایسے میں قرآن کی آیات پڑھ کر ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ڈالنے کا رویہ نہ علمی طور پر درست ہے اور نہ عملی طور پر کسی مسئلے کو حل کرنے والا ثابت ہوگا۔ اس کے لیے قانون فطرت کی پابندی ضروری ہے۔

احیائے اسلام اور قرآن مجید

ایک زمانہ تھا کہ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنا ایک ناقابل تصور بات تھی۔ عوام تو کجا خواص کی ایک بڑی تعداد بھی یہ نہیں جانتی تھی کہ قرآن میں کیا لکھا ہوا ہے۔ تاہم الحمدللہ اب صورتحال یہ ہے کہ بہت بڑے پیمانے پر لوگ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ تاہم وہ قرآن جو قوموں کو سرفراز کرتا رہا ہے، ہمارے ہاں اس کے فہم کا ذوق عام ہونے کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ ایک ہمہ گیر زوال کا شکار ہے۔ آج کی گفتگو میں اس مسئلے کا جائزہ تاریخی تناظر میں لے کر اس صورتحال کے اسباب اور حل پر گفتگو کی جائے گی۔

برصغیر اور مسلمانوں کی فکری امامت

مسلمانوں کی تاریخ کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہے جس میں مسلمانوں کی قیادت عرب یا بنی اسماعیل کررہے تھے۔ کہیں کوئی اور حکمران ہوتا تو وہاں بھی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا۔ اس دور میں مسلمانوں کی فکری اور علمی امامت بھی انھی خطوں کے باسی کررہے تھے جو عربوں کے ماتحت تھے۔ ایک وقت آیا کہ عربوں کا یہ اقتدار ختم ہوا۔ پہلے تاتاریوں کے ہاتھوں خلافت عباسیہ کا خاتمہ ہوا اور پھر ان کے دوسرے بڑے مرکز اسپین سے بھی رفتہ رفتہ عرب اور مسلمان بے دخل کردیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ان علاقوں میں علم و فکر کا دور ختم ہوگیا اور امت کی سیاسی قیادت کے ساتھ فکری رہنمائی بھی ان خطوں سے رخصت ہوگئی۔

اس کے بعد مسلمانوں کی تاریخ کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں بھی مسلمان پہلے دور کی طرح دنیا کی امامت کے منصب پر فائز تھے۔ مگر اس دفعہ مسلمانوں کی قیادت بنی اسماعیل یا عربوں کے ہاتھ سے لے لی گئی۔ جس کے بعد ہندوستان اور ایران کی مقامی سلطنتوں کے علاوہ

دنیا کے تین براعظموں یعنی ایشیا، یورپ اور افریقہ میں پھیلی ہوئی یہ ترکی کی خلافت عثمانیہ تھی جسے مسلمانوں کی سیاسی قیادت حاصل تھی۔ یہ سب کے سب عجمی تھے۔ سیاسی قیادت کی اس تبدیلی کے ساتھ امت کی فکری امامت بھی تبدیل ہوگئی۔ امت کی تاریخ کے اس دوسرے حصے میں یہ سعادت برصغیر کو نصیب ہوئی کہ مسلمانوں کی فکری امامت کا ظہور اس خطے سے ہوا۔

برصغیر میں اسلام کا فروغ

پچھلی کئی صدیوں سے پہلے فکر اسلامی اور پھر احیائے اسلام کا اصل مرکز یہی خطہ رہا ہے۔ اس عمل کا اولین آغاز اس وقت ہوا جب تاتاریوں کی تباہ کاریوں سے پناہ کی تلاش میں وسط ایشیا اور بلاد عرب کے لوگ ہندوستان آنا شروع ہوئے۔ چین سے لے کر روس اور وسط ایشیا سے لے کر یورپ تک تاتاری جہاں جاتے یلغار کرتے اور کوئی ان کا مقابلہ کرنے والا نہیں تھا۔ ایسے میں جائے پناہ صرف ہندوستان تھا جہاں سلاطین دہلی حکمران تھے۔ ان سلاطین نے عشروں تک تاتاریوں کو پے در پے شکستیں دے کر اس وقت انھیں اس خطے پر قابض ہونے سے باز رکھا جب پوری دنیا تاتاریوں کی رزم گاہ بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنی جان اور آبرو بچا کر اس خطے میں آگئی۔

ان لوگوں کے آنے کے ساتھ ہی ان علاقوں میں اسلام کا فروغ تیزی سے ہوا جو اب موجودہ پاکستان میں شامل ہیں اور اُس وقت بدھ مت کے زیر اثر ہونے کی بنا پر ہندووانہ ذات پات کے نظام کے اثرات سے محفوظ تھے۔ اُس دور میں مسلمانوں کا مذہبی فکر چونکہ تصوف اور فقہ کے خانوں میں بٹا ہوا تھا، اس لیے اولاً یہاں فکر اسلام کی عملی شکل کا ظہور تصوف کے مختلف سلاسل اور فقہ حنفی کی صورت میں ہوا۔ تاہم اس کے بعد پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور پھر شاہ ولی اللہ کے اثر سے علم حدیث کے اثرات آنا شروع ہوئے۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے دو بیٹوں یعنی شاہ

عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے ترجمہ قرآن کا وہ سلسلہ شروع کیا جس کی بنا پر لوگوں کی قرآن مجید تک رسائی ہونے لگی۔ جبکہ علماء کے لیے اصول تفسیر پر شاہ صاحب نے الفوز الکبیر فی اصول التفسیر لکھ کر غور و فکر کی ایک نئی راہ کھولی۔

تفسیر قرآن کے مختلف دھارے

شاہ صاحب اور ان کے خانوادے کے ذریعے سے اٹھارہویں صدی میں شروع ہونے والا فہم قرآن کا یہ سفر انیسویں صدی میں جاری رہا۔ مسلمانوں کے مختلف اہل علم و دانش نے اپنے اپنے پس منظر میں قرآن مجید کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا۔ انیسویں صدی کے سائنسی فکر اور عقلیت کے زیر اثر اسلام پر جو فکری حملہ ہوا تھا، اس کا جواب دینے کے لیے سر سید نے اپنے رسالے تہذیب الاخلاق میں قرآن مجید کی تفسیر کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ اسلام پر تعلیم یافتہ طبقات کا اعتماد بحال رکھنے کی ایک کوشش تھی، مگر اس میں انیسویں صدی کی سائنس کو معیار مان کر اسلامی معتقدات کی تشریح کی جو کوشش کی گئی تھی، اس پر سخت تنقیدیں ہوئیں۔

اس سلسلے کا سب سے منظّم تفسیری جواب مولانا عبدالحق حقانی دہلوی کی تفسیر حقانی کی شکل میں سامنے آیا جو اسی زمانے میں لکھی گئی روایتی دینی حلقے کی ایک اہم تفسیر بھی ہے۔ اس کے بعد آنے والی تفاسیر میں سے جو تفاسیر روایتی طرز کی نمائندہ کہی جاسکتی ہیں، ان میں مولانا اشرف علی تھانوی کی بیان القرآن اور مولانا محمود الحسن کا ترجمہ جس پر حواشی لکھنے کا بیشتر کام مولانا شبیر احمد عثمانی نے کیا، نمایاں ہیں۔ یہ گویا کہ تفسیر کا دوسرا دھارا تھا جو اس زمانے میں برصغیر میں نمایاں ہوا۔ بیسویں صدی کے اسی ابتدائی زمانے میں تفسیر قرآن کے تیسرے دھارے پر امام فراہی خاموشی سے کام کر رہے تھے۔ مگر اس وقت تک ان کا کام صرف علما اور ان کے شاگردوں تک محدود تھا۔

احیائے اسلام کی فکراورقرآن فہمی کا عمومی ذوق

اٹھارہویں صدی سے بیسویں صدی کے آغاز تک کا یہ زمانہ مسلمانوں کے عالمگیر زوال کا زمانہ تھا۔ دوسری طرف یورپی قوتیں بتدریج غلبہ حاصل کررہی تھیں۔ ہندوستان میں یہ سیاسی زوال بدرجہ اولیٰ جاری تھا۔شاہ صاحب کی وفات (1762ء) کے بعد ایک صدی کے اندر اندر 1857 میں ہندوستان سے مسلمانوں کا اقتدار ختم ہوگیا۔1914 میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اورسلطنت عثمانیہ کا سورج بھی غروب ہوگیا۔

بیسویں صدی کے آغاز پر مسلمانوں کا سیاسی زوال اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔اس سیاسی زوال کے زیر اثر مسلمانوں میں احیائے اسلام کی فکر پیدا ہوئی جس کا مطمع نظر ایک دفعہ پھر دنیا پر اسلام کی عظمت کو غالب کرنا تھا۔اس فکر کے حاملین وہ اہل علم تھے جنھوں نے پچھلے تینوں تفسیری دھاروں کی طرح قرآن کے ترجمہ وتفسیر کا کام کرنے کے علاوہ عوام الناس میں قرآن فہمی کا ذوق بھی پیدا کیا۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے صحافت کے نئے نئے عام ہونے والے انتہائی موثر ذریعہ ابلاغ کو استعمال کرتے ہوئے اپنے خیالات کو وسیع پیمانے پرعوام میں پھیلانا شروع کردیا۔احیائے اسلام اوردعوت الی القرآن کا نعرہ لگانے اورصحافت کے ذریعے سے بہت وسیع پیمانے پر اپنے خیالات کا ابلاغ کرنے والے یہ اہل علم مولانا آزاد اور مولانا مودودی ہیں۔مولانا آزاد نے احیائے اسلام کی صدا بلند کی اورساتھ میں ترجمہ وتفسیر کا کام بھی کیا۔مگر عملی سیاست میں ان کی دلچسپی ان کے تفسیری اورفکری کام میں رکاوٹ بنی رہی اوران کی تفسیر ’’ترجمان القرآن‘‘ مکمل نہ ہوسکی۔مولانا مودودی نے عملی سیاست سے مکمل کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے صرف فکری محاذ پر خودکو وقف کیا اوراپنے رسالے ترجمان القرآن سے احیائے اسلام کوایک پوری فکرکی شکل میں منظّم کرکے پیش کیا جس کی اساس قرآن مجید پر رکھی گئی تھی۔

قرآن مجید کا یہی وہ پس منظر تھا جس کی بنا پر مولانا مودودی نے مولانا آزاد کی طرح جنھوں نے الہلال اور البلاغ کے ذریعے سے دعوت الی القرآن کی صدا بلند کی تھی، عوام الناس خاص کر پڑھے لکھے لوگوں کو قرآن مجید کی طرف متوجہ کیا۔ اس سلسلے میں ان کی تفسیر تفہیم القرآن نے جس کا ترجمہ سلیس و آسان اور تفسیر معلوماتی تھی، بہت اہم کردار ادا کیا۔ اسی سلسلے کو ڈاکٹر اسرار مرحوم نے مزید آگے بڑھایا۔ وہ فکری طور پر اسی احیائے اسلام کو خلافت کے عنوان سے پیش کرتے رہے اور ساتھ میں آزاد کی دعوت الی القرآن کو رجوع الی القرآن کی اپنی ایک تحریک کی شکل میں عملی قالب دینے میں کامیاب رہے۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ ایک زبردست مقرر تھے اس لیے انھوں نے زبانی طور پر تفسیر قرآن کر کے ٹیلی ویژن، آڈیو کیسٹس اور پھر زندگی کے آخری زمانے میں انٹرنیٹ کے ذریعے سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو قرآن مجید کی طرف متوجہ کیا۔

تفسیر کے تمام فکری دھاروں کے برعکس یہ اس دھارے کے بزرگوں کا بڑا کام ہے کہ انھوں نے عوامی ذرائع اختیار کر کے قرآن مجید کا ذوق بہت بڑے پیمانے پر عوام اور خاص کر پڑھے لکھے لوگوں میں پیدا کر دیا ہے۔ بیسویں صدی میں قرآن مجید کے حوالے سے عملی طور پر کی جانے والی یہ وہ بے مثال خدمت ہے جس کی کوئی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔

اصل مسئلہ اور اس کے اسباب

ان بزرگوں کی یہ خدمت اپنی جگہ بہت اہم ہے، مگر ایک صدی کی اس مساعی جلیلہ اور جان و مال کی تمام تر قربانیوں کے باوجود ایک طرف احیائے اسلام کا خواب ہنوز تشنہ تعبیر ہے اور دوسری طرف انسانیت وہ سیرتیں دیکھنے کو ترس رہی ہے جو صحابہ کرام کی شکل میں قرآن مجید کی دعوت نے پیدا کی تھیں۔

ہمارے نزدیک پہلے المیے کا بنیادی سبب اس حقیقت کو نہ جاننا اور نہ ماننا ہے کہ خدا کی دنیا

میں قوموں کو غلبہ اور عروج دو بنیادی اوصاف کی بنا پر ملتا ہے۔ ایک مروجہ علم اور ٹیکنالوجی میں مہارت اور توانائی کے ذخائر پر کنٹرول سے۔ دوسرے اخلاق میں برتر مقام حاصل کرنے سے۔ گویا علم واخلاق دنیا میں غلبے اور اقتدار کی کنجی ہیں۔ اس میں سے علم (مادی علوم) تو مذہبی فکر کا براہ راست نہ تو موضوع تھا نہ انھوں نے اس حوالے سے معاشرے کو حساس بنایا۔ البتہ اخلاقی تربیت مذہبی فکر کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہوتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے یہاں ایک ایسی علمی غلطی ہوئی جس نے معاشرے کے اخلاقی زوال کا راستہ ہموار کر دیا۔

وہ غلطی یہ تھی کہ قرآن مجید جس کی اصل دعوت ایمان واخلاق کی دعوت ہے اور جس کی دعوت کو قبول کرنے کے بعد دنیا نے صحابہ کرام کی شکل میں اعلیٰ ترین انسانوں کی سیرتیں دیکھی تھیں، اس قرآن عظیم کو احیائے اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والے کارکن پیدا کرنے والی کتاب بنا دیا گیا۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ احیائے اسلام کی فکر جس چیز کو نصب العین یا ہدف بنا کر ایک فرد کے سامنے رکھتی ہے وہ اسلام کا سیاسی غلبہ ہے۔ یہ ایک خارجی ہدف ہے۔ جب کسی شخص کا اصل ہدف خارج میں تبدیلی بن جائے تو نفسیاتی طور پر یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ اپنے داخل کو اصل نشانہ بنائے۔ ایسے شخص کی توجہ ہمیشہ خارج کی طرف رہے گی۔ اس کا باطن بدترین خرابیوں کی آماجگاہ بن جائے گا اور اسے خبر تک نہ ہوگی۔

تاہم ایسا نہیں ہوگا کہ دینی احکام کی فہرست سے یہ شخص ایمان واخلاق کو نکال دے گا۔ مگر یہ کبھی اس کا اصل مسئلہ نہیں بنیں گے۔ جبکہ انسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کا پورا فکر وعمل اسی چیز کے اردگرد گھومتا ہے جسے ان کے نزدیک مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ قرآن مجید اسی وجہ سے ایمان واخلاق کو انسان کے اصل ہدف کے طور پر سامنے رکھتا ہے۔ وہ صاف بتاتا ہے کہ آخرت کی نجات انھی پر موقوف ہے۔ وہ اس بات کو اختصار سے بھی دہراتا رہتا ہے اور جگہ جگہ

اس کی تفصیل بھی بیان کرتا ہے۔ دہرانے کا یہ عمل اس لیے کیا جاتا ہے کہ انسانی نفسیات ایک دفعہ کی بات کا اثر قبول نہیں کرتی۔ چنانچہ بار بار ایمان واخلاق کی دعوت کو سامنے لا کر قرآن چاہتا ہے کہ لوگ نفسیاتی طور پر خدا سے متعلق ہو جائیں اور عملی طور پر اعلیٰ ترین اخلاقی معیارات کے حامل بن جائیں۔

احیائے اسلام کی فکر کا سیاسی پس منظر

تاہم بد قسمتی سے احیائے اسلام کی فکر جس نے قرآن کو سب سے بڑھ کر عام کیا وہ اصلاً مسلمانوں کے ہمہ گیر سیاسی زوال کے پس منظر سے اٹھی تھی جو انیسویں اور بیسویں صدی کے آغاز کے وقت پھیلا ہوا تھا۔ احیائے اسلام کی فکر کے ظہور کے وقت حالات یہ تھے کہ بیسویں صدی کے آغاز پر بارہ سو برس تک دنیا کی سول سپر پاور رہنے والے مسلمانوں کی حکومت دنیا کے صرف تین فی صد حصے پر باقی بچی تھی اور دنیا کے چوراسی فی صد حصے پر یورپی طاقتوں کا قبضہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس سیاسی زوال کو روکنے کی ہر تدبیر پے در پے ناکامی سے دوچار ہو رہی تھی۔ 1757 کی پلاسی کی شکست، 1799 میں ٹیپو سلطان کی شکست، 1841 میں سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین کی شکست اور 1857 کی جنگ آزادی کی شکست کے علاوہ برصغیر سے باہر سنیاسی تحریک، عمر مختار، امام شامل، مھدی سوڈانی، عبدالکریم الخطابی اور سب سے بڑھ کر پہلی جنگ عظیم میں خلافت عثمانی کی شکست سمیت ناکامیوں کی ایک طویل قطار نے مسلم ذہن کو زبردست صدمے سے دوچار کر دیا تھا۔

ایسے میں نہ احیائے اسلام کی صدا کا بلند ہونا غیر متوقع تھا نہ اس صدا ا کو پذیرائی ملنا کوئی عجیب بات تھی۔ یہ ایک تاریخی جبر تھا۔ بد قسمتی سے اس تاریخی جبر کے ساتھ جب قرآن مجید کی دعوت اٹھی تو خالص بے آمیز طریقے پر قرآن مجید پر غور و فکر اس کے ساتھ نہ تھا۔ چنانچہ اس نے

سیاسی غلبہ کو مذہبی فریضہ بنا کر عام لوگوں کو اس کام کے لیے اٹھا دیا۔ مسلم اشرافیہ اور غیر مسلموں کے خلاف ختم نہ ہونے والی ایک جنگ شروع ہوگئی۔ اس کے نتیجے میں جو تباہی ہو چکی ہے وہ سر کی آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے۔ مگر اب تباہی کو ہی گلیمرائز کر دیا گیا ہے۔ زوال پذیر امتوں کی تاریخ میں یہ مکمل تباہی سے پہلے کا مرحلہ ہوتا ہے۔ اور اس مکمل تباہی کی وجہ وہ اخلاقی زوال بنے گا جو قرآن کی اصل دعوت کو چھوڑنے کے نتیجے میں پیدا ہو چکا ہے۔

تباہی سے بچنے کا راستہ

اس آنے والی مکمل تباہی سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ قرآن مجید کی ایمان و اخلاق کی دعوت کو تحریک بنا دیا جائے۔ اس کے لیے بہت زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل دعوت بیان کرنے میں قرآن مجید بالکل واضح ہے۔ یہ حقائق قرآن کے ہر صفحے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ قرآن نے جگہ جگہ ایمان و عمل صالح پر جنت کی بشارت دی ہے۔ درجنوں مقامات پر ان اعمال صالح کی تفصیل کر کے بتا دیا ہے کہ یہی اصل مطلوب ہے۔ ان مقامات میں سے اہم ترین کو ہم نے اپنی کتاب ''قرآن کا مطلوب انسان'' میں جمع کر دیا ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ اپنے ہر تعصب اور خواہش سے اوپر اٹھ کر قرآن کے اصل پیغام کو سمجھیں۔ اس کی دعوت کو اپنی زندگی بنائیں۔ اس کے پیغام کو اپنی سیرت بنائیں۔ جب اس طرح کے لوگ معاشرے میں بتدریج بڑھنا شروع ہوتے ہیں تو ہر طرف خیر پھیلنے لگتی ہے۔ ایک ایک خاندان، ایک ایک محلّہ اور ایک ایک بستی میں ہدایت کا نور پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ پورا معاشرہ اسلامی اخلاق کا نمونہ بن جاتا ہے۔ کوئی جبر نہیں ہوتا۔ کوئی دھونس اور دھمکی نہیں دی جاتی۔ کوئی حکم ٹھونسا نہیں جاتا۔ لوگوں کے قلوب قرآن کی دعوت سے مسخر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دنیا اور آخرت کی ساری بھلائیاں اس معاشرے کا مقدر ہوتی

ہیں۔ یہ نہ ہو اور بالجبر اقتدار پر قبضہ کرکے زبردستی اسلام کا نعرہ لگا دیا جائے تو سوائے منافقت اور جبر کے کچھ سامنے نہیں آتا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو پچھلے کئی عشروں سے دنیا نے دیکھا ہے۔اب وقت آ گیا ہے کہ اسلام کی اصل دعوت دنیا تک پہنچے۔ یہ انشاء اللہ العزیز اب ہو کر رہے گا۔لوگ بدلیں یا نہ بدلیں۔اصل دعوت انشاء اللہ ہر ہر شخص تک ضرور پہنچ کر رہے گی۔

حضور کے غلبے کی نوعیت

اس گفتگو کے آخر میں مناسب ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنی قوم پر غلبہ کی درست نوعیت کو بھی واضح کر دیا جائے۔ کیونکہ اسے نہ سمجھنے کی بنا پر ان اہل علم کو یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ یہ کوئی سیاسی جدوجہد کے ذریعے سے حاصل کی گئی کامیابی تھی۔

حضور کا اپنی قوم پر غلبہ دراصل خدا کی اس سزا و جزا کا ظہور تھا جو ہر رسول کی آمد کے موقع پر اس کی قوم کے لیے برپا کی جاتی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے لیے خدا کا فیصلہ اسی طرح لے کر آئے تھے جس طرح حضرات نوح، ہود، صالح،شعیب،موسیٰ اور اللہ تعالیٰ کے دیگر رسول علیہم السلام لے کر آئے تھے۔صرف اس فرق کے ساتھ کہ ان رسولوں کے معاملے میں تکذیب کے بعد عذاب الٰہی فطرت کی طاقتوں کے ذریعے سے آیا تھا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قوم کی ایک بڑی تعداد ایمان لے آئی تھی، اس لیے اس دفعہ یہ فیصلہ ہوا کہ ان صحابہ کے ہاتھوں منکرین کو سزا دی جائے گی (التوبہ 14:9)۔تاہم سوائے قریش کی لیڈر شپ کے پوری قوم ایمان لے آئی۔ان کو انعام کے طور پر زمین کا اقتدار دے دیا گیا،(النور 55:24)۔کیونکہ رسولوں کے باب میں یہی قانون خداوندی ہے کہ ان کے منکرین دنیا میں ہلاک کر دیے جاتے ہیں اور ماننے والوں کو زمین کا وارث بنایا جاتا ہے۔

قرآن مجید اس پورے معاملے کی نہ صرف تفصیل کرتا ہے بلکہ ہر مقام پر صاف بتاتا ہے کہ

جو ہورہا ہے وہ خالص خدائی فیصلے کا ظہور ہے۔ مثال کے طور پر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ (اس سرزمین کے) تمام ادیان پر اسے غالب کردے، خواہ مشرکین اسے کتنا ہی ناپسند کریں۔''

دیکھ لیجیے کہ کس طرح یہ آیت حضور کے غلبہ دین کو خدا کا اٹل فیصلہ قرار دے رہی ہے۔ قرآن میں یہ بات تین جگہ دہرائی گئی اور دنیا نے بچشم سر یہ دیکھا کہ کس طرح خدا نے اپنے وعدے کو پورا کر دکھایا۔ اس آیت کے نزول کے تھوڑے ہی عرصے بعد سرزمین عرب پر دین حق کا غلبہ ہوگیا۔ یہ ایک سچے نبی کی پیش گوئی تھی جو حضور کی زندگی ہی میں اور مشرکین عرب کی تمام تر مخالفت کے باوجود بعینہٖ پوری ہوگئی۔ اور اب یہ قرآن میں حضور کی سچائی کا ابدی ثبوت بن کر ہمیشہ کے لیے درج ہے۔

یہ بات اگر سمجھ لی جائے تو اسلام کی حقانیت کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا ایک بے مثال ذریعہ ہے۔ نہ سمجھی جائے تو نہ پہلے تباہی کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ ہوا نہ آئندہ ہونے کا کوئی امکان ہی موجود ہے۔ ہم اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ہر تباہی اور بربادی سے محفوظ رکھے اور بجائے کسی سزا کے ہمیں ہدایت سے نوازے۔

جہاں رہیے بندگان خدا کے لیے باعث رحمت بن کر رہیے، باعث آزار بن کر نہ رہیں۔

مایوسی اور بے صبری شیطان کا ہتھیار ہے صبر اور امید مومن کا ہتھیار ہے (ابو یحییٰ)

ابویحییٰ

مضامین قرآن (57)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی درست اساسات: تقویٰ

اللہ تعالیٰ سے تعلق کی ایک بہت اہم اساس جو کئی پہلوؤں سے ایمان کے بعد دوسری بنیادی اساس ہے، اللہ کا تقویٰ ہے۔ قرآن مجید میں تقویٰ کا لفظ تین مفاہیم میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا ایک مفہوم جو اصل ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کی پکڑ اور اس کے غضب سے بچنے کا شدید ترین جذبہ ہو۔ اس کا دوسرا مفہوم اس عملی کیفیت کو بیان کرتا ہے جس میں انسان اس طرح جیتا ہے کہ وہ خدا کے غضب سے بچنے کے لیے اس کی ہر نافرمانی چھوڑ دیتا ہے۔ اس کا تیسرا مفہوم اس نتیجے کو بیان کرتا ہے جو قیامت کے دن نکلے گا یعنی ایسے خداترس انسانوں کو اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ اور دوزخ کی سزا سے بچالیں گے۔ ہماری اس گفتگو میں اس لفظ کا پہلا مفہوم ہی مراد رہے گا کیونکہ وہ اصل جذبہ ہے جو پیدا کرنا مقصود ہے۔ باقی دو تو اس کے فطری نتائج ہیں۔

قرآن مجید نے تقویٰ کی اس تعبیر کو بکثرت استعمال کیا ہے۔ اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسانی فطرت میں سب سے بڑھ کر اپنے تحفظ اور بچاؤ کا داعیہ پایا جاتا ہے۔ خطرے اور اندیشے کا سامنا ہوتے ہی ہر انسان پوری طرح متحرک ہوجاتا ہے۔ بہت سی وہ طبیعتیں جو نعمتوں اور انعامات کا ذکر سن کر متحرک نہیں ہوتیں، خطرات سامنے آتے ہی پوری طرح فعال ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ انسانوں میں کوئی تحریک پیدا کرنے اور انھیں فعال کرنے کے لیے انسان کے اس جذبے کو بیدار کرنا ضروری ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں جبکہ یہ خطرہ کوئی فرضی نہ ہو بلکہ حقیقی ہو اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے آخری درجہ میں تباہ کن ہو۔ ایسے میں یہ بڑی

خیر خواہی کا کام ہوتا ہے کہ لوگوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیا کا منصب قرآن مجید میں انذار بیان ہوا ہے۔ جس کا مفہوم ہی خطرے سے متنبہ کرنا ہے۔ علما کا منصب بھی انذار بیان ہوا ہے۔ یہی وہ انذار ہے جو بندوں میں خدا کا خوف یا تقویٰ پیدا کرتا ہے۔

تقویٰ کی تعبیر کو قرآن میں زیادہ استعمال کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جس خدا کے حضور پیشی سے ڈرایا جاتا ہے وہ اپنی تمام تر عظمت کے باوجود پردہ غیب میں مستور ہے۔ دوسری طرف اس کی فرمانبرداری سے دور کر دینے والی خواہشات اور جذبات ایک طرف انسان کے اندر سے اپنا ظہور کرتے ہیں اور اپنی بات منوانے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں اور دوسری طرف حالات اور ماحول بھی پوری طرح انسان کو اپنے گھیرے میں لے کر اپنے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ ایسے میں یہ خدا کے خوف کا جذبہ ہی ہے اور اس کی پکڑ سے بچنے کا داعیہ ہی ہے جو انسان کو اندر اور باہر کے اس شدید دباؤ کے مقابلے میں ثابت قدم رکھتا ہے۔

تقویٰ کے لیے دیگر تعبیرات

اللہ تعالیٰ کا یہ تقویٰ کوئی منفی چیز نہیں بلکہ یہ ایک مثبت جذبہ ہے جو ایک حقیقی خطرے سے انسان کو بچاتا ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے قرآن مجید نے ایک دوسری تعبیر جگہ جگہ استعمال کی ہے یعنی خوف۔ خوف اس جذبے کا نام ہے جو کسی ممکنہ مگر حقیقی نقصان کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ اسے عام زبان میں اندیشہ کہتے ہیں۔ قرآن مجید آخرت کی زندگی کا جو تصور دیتا ہے، اس میں دو حقیقتیں ایسی ہیں جن سے بے نیاز ہو کر کوئی معقول آدمی نہیں جی سکتا۔ ایک یہ کہ روزِ قیامت انسان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ یہ حساب اس طرح لیا جائے گا کہ انسان کا ہر ہر عمل ہی نہیں بلکہ ان اعمال کے پیچھے کارفرمانیت بھی کھول دی جائے گی۔ دوسری حقیقت یہ

ہے کہ آنے والی دنیا میں دو میں سے ایک انجام انسان کا منتظر ہے۔ایک جنت اور دوسرا جہنم۔ جہنم اتنی خوفناک اور نا قابل برداشت حد تک تکلیف دہ جگہ ہے کہ وہاں لمحہ بھر گزارنے کا تصور بھی نا قابل برداشت ہے۔ یہ دونوں چیزیں اگر حقیقت ہیں اور بلاشبہ حقیقت ہیں تو پھر ان کے متعلق فکرمند ہونا، اندیشہ ناک ہونا اور خوف محسوس کرنا ایک بالکل فطری چیز ہے۔ یہی خوف ہے جو انسان کو خدا کی نافرمانی سے بچاتا ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خوف میں آکر کسی نا قابل تلافی نقصان سے بچ جانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ بے خوف رہ کر انسان اس نقصان میں پڑ جائے۔

تقویٰ کو مزید واضح کرنے کے لیے قرآن مجید نے کچھ اور تعبیرات اختیار کی ہیں۔ یہ تعبیرات واضح کرتی ہیں کہ تقویٰ محض ایک سلبی اور منفی چیز نہیں بلکہ ایک مثبت احساس کا نام ہے۔ یہ تعبیرات رہبت ،خشوع اور اخبات ہیں۔ رہبت اس لرزش اور کپکپی کا نام ہے جو کسی کی عظمت وجلالت کے تصور سے دل پر طاری ہوجاتی ہے۔ یہ کپکپی آگے بڑھتی ہے اور خشوع پیدا کرتی ہے۔خشوع قلب کے اس جھکاؤ کا نام ہے جو کسی ہستی کی عظمت وجلال سے پیدا ہوتا ہے اور دل میں بے نیازی اور بے پروائی کے بجائے عاجزی اور پستی کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ جبکہ اخبات میں انسان ہر ایک سے کٹ کر اپنے رب کی طرف پوری دل جمعی سے متوجہ ہوجاتا ہے اور کامل یکسوئی کے ساتھ اس کے سامنے جھک جاتا ہے۔

تقویٰ ان سب احساسات سے خود بخود پیدا ہوجاتا ہے۔ انسان یہ جان لیتا ہے کہ اس کا واسطہ ایک انتہائی بلند و عظیم ہستی سے ہے۔ وہ ہستی نا قابل تصور حد تک طاقتور ہے۔اس کی پکڑ اور پہنچ سے کوئی بچ کر نکل نہیں سکتا۔ وہ پکڑ لے تو کوئی بچا نہیں سکتا۔اس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔اس کی ایک نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔اس کے ایک اشارے سے زمین وآسمان الٹ سکتے ہیں۔اس کی قدرت میں سب کچھ ہے۔اس کی طاقت بے اندازہ اور اختیار لامحدود

ہے۔ یہ عظیم و بلند ہستی لمحہ لمحہ انسان کے ساتھ موجود ہے۔ انسان جہاں کہیں ہو اس کے علم میں ہوتا ہے۔ ہر قول و فعل وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔ دل کا حال ہو یا نگاہ کی خیانتیں کچھ بھی اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ انسان اس خدا کے سامنے آخری درجہ میں ننگا ہے۔ اس کا باہر ہی نہیں اس کا اندر بھی خدا کے سامنے بالکل عریاں ہے۔ ایسے خدا کی عظمت، کبریائی، ہیبت و جبروت کا احساس انسان کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ یہ احساس اس کے دل کو لرزا دیتا ہے۔ اس رب کے سامنے انسان کی روح سراپا نیاز بن جاتی ہے۔ چنانچہ عبادت کے اندر بھی انسان رب العالمین کے سامنے عاجزی کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے اور عبادت سے باہر بھی اس کے خوف سے لرزتا ہے۔ وہ دل سے ہر دوسرے کا خوف نکال کر صرف اسی کے خوف میں جیتا ہے اور سب سے کٹ کر صرف اسی کا ہو رہتا ہے۔ وہ ہر صورت میں ایسے بلند رب کی پکڑ سے بچنا چاہتا ہے۔ چنانچہ رہبت، خشوع اور اخبات بندہ مومن میں تقویٰ پیدا کر دیتے ہیں یہی وہ تقویٰ ہے جس کے لیے دنیا میں ہدایت کا وعدہ ہے اور آخرت میں نجات کا۔

قرآنی بیانات

''وہ عالی مرتبت ہے۔ عرش کا مالک ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، اپنے حکم کی روح (وحی) ڈال دیتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو روز ملاقات سے خبردار کر دے''، (غافر 15:40)۔

''ہم نے تم کو حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی ہے جس کے اندر ایک نذیر نہ آیا ہو''، (الفاطر 24:35)

''یہ تو نہ تھا کہ سب ہی مسلمان اٹھتے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ کچھ لوگ نکلتے تاکہ دین میں بصیرت حاصل کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو بھی آگاہ کرتے جب کہ وہ ان کی طرف لوٹتے کہ وہ بھی احتیاط کرنے والے بنتے''، (التوبہ 122:9)

''اے لوگو! اپنے خداوند سے ڈرو بے شک قیامت کی ہلچل بڑی ہی ہولناک چیز

ہے۔''،(الحج 1:22)

''اوراس دن سے ڈروجس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو جواس نے کمائی کی ہے پوری پوری مل جائے گی اوران پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔''،(البقرہ 281:2)

''اے لوگو، اپنے اس رب سے ڈروجس نے تم کوایک ہی جان سے پیدا کیا......اورڈرواُس اللہ سے جس کے واسطے سے تم آپس میں مدد کے طالب ہوتے ہواورڈرو قطع رحم سے۔ بے شک اللہ تمھاری نگرانی کررہاہے۔''،(النساء 1:4)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈروجیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرو تم مگراس حال میں کہ تم اسلام پر ہو۔''،(آل عمران 102:3)

''اے ایمان والو، اللہ سے ڈرواور چاہیے کہ ہر نفس اچھی طرح جائزہ لے رکھے اس کا جواس نے کل کے لیے کیا ہے۔ اوراللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔''،(الحشر 18:59)

''تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور ہم نے اس کو یحییٰ عطا فرمایااوراس کی بیوی کواس کے لیے سازگار کردیا۔ بے شک یہ نیکی کے کاموں میں سبقت کرنے والےاورامید وبیم ہر حال میں ہماری ہی عبادت کرنے والےاور ہم سے خشوع رکھنے والے تھے۔''،(الانبیا 90:21)

''اپنی مراد کو پہنچ گئے ایمان والے۔ جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔''، (المومنون 1-2:23)

''(اِس کوسن کر) وہ روتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں اور یہ اُن کے خشوع میں اضافہ کردیتا ہے۔''،(الاسرا 109:17)

''اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مشروع کی تا کہ اللہ نے ان کو جو چوپائے بخشے ہیں ان پر وہ اس کا نام لیں۔ پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اپنے آپ کواسی کے حوالے کرو۔ اور خوش خبری دو ان کو جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔''،(الحج 34:22)

''باقی رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور جو اپنے رب کی طرف جھک پڑے تو وہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔''،(ھود 23:11)

ڈاکٹر شہزاد سلیم/محمد محمود مرزا

خود تلقینی کی طاقت

اس دنیا میں تمام انسان دل اور دماغ کی ایسی منفرد خصوصیات اور ایسے نظام سے لیس ہوتے ہیں جو کہ خود تصحیح کے لیے نہایت سازگار ہوتا ہے۔ انھی عمدہ اوصاف میں سے ایک وصف خود تلقینی کا ہے۔

خود تلقینی ایک ایسا طاقتور ہتھیار ہے جو ہر اس شخص کے لیے مددگار ثابت ہوسکتا ہے جو اپنے رویے کو ٹھیک کرنا چاہتا ہے یا مزید بہتر کرنا چاہتا ہے۔ ہم میں سے جو بھی ایسا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو مستقل اس بات کی یاددہانی کراتا رہے کہ اسے ایک بہتر انسان بننا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ تصور بھی اپنے ذہن میں قائم کرتا رہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے۔ یہ تصور جتنا زیادہ قوی ہوگا اتنا ہی زیادہ اس طریقہ کار کی کامیابی کا امکان ہوگا۔

یہ درحقیقت ایک ایسا کامیاب نفسیاتی حربہ ہے جو سالہا سال کا آزمودہ ہے۔ یہ طریقہ بالواسطہ طور پر انسان کے اندر اپنے ہدف کو پانے کے لیے قوتِ ارادی پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں انسان غیر شعوری طور پر ایسے طاقتور ہتھیار سے لیس ہو جاتا ہے جس کی مدد سے وہ اپنے آپ کو با آسانی بدل سکتا ہے۔ تاہم ہوسکتا ہے کہ بظاہر یہ طریقہ کار کمزور اور بے اثر دکھائی دیتا ہو مگر اس کے باوجود یہ ہماری شخصیت کے اندر اس ضمن میں بعید از قیاس معجزات رونما کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

مجاہد خٹک

سوال اٹھانے کا کلچر

اب تک امریکہ نے 368 نوبل پرائز حاصل کیے ہیں، برطانیہ نے 132، جرمنی نے 107، فرانس 62، سویڈن 30، سوئٹزرلینڈ 26، جاپان 26، کینیڈا 23 اور روس نے 23 نوبل انعام حاصل کیے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمان ممالک کو دیکھا جائے تو وہاں چند افراد ہی اس اعزاز کو حاصل کر پائے۔

اگر نوبل انعام کو آپ متنازعہ سمجھتے ہیں تو پھر ایسے سائنس دانوں کی فہرست بنا لیں جنہوں نے جدید دور میں نئے اور انقلابی قسم کے نظریات پیش کیے ہوں۔ اس میں کسی مسلمان کا نام بمشکل ہی آ پائے گا۔ اسی طرح دور جدید کے اہم ترین فلسفی، تاریخ دان، ماہر معاشیات وعمرانیات اور نفسیات دانوں کے ناموں پر نگاہ دوڑائیں تو یہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ پچھلی چند صدیوں سے علم کے ہر میدان میں مسلمانوں نے کوئی حصہ نہیں ڈالا۔

جب پونے دو ارب کے لگ بھگ آبادی میں سے چند سو بڑے دماغ پیدا نہ ہو پائیں تو اس کا مطلب ہے کہ کہیں بہت بڑی گڑبڑ ہے۔ ایسے حالات میں لازم ہے کہ اپنی توانائیاں اغیار کی خامیاں تلاش کرنے کے بجائے اپنے محاسبے پر صرف کی جائیں۔ جن دانشوروں کی خوردبینی نگاہیں مغرب کی خامیاں تلاش کرنے میں لگی رہتی ہیں ان کی حیثیت نشہ آور ادویات کی طرح ہے، جن سے پورے معاشرے کو لمحاتی خمار تو مل جاتا ہے لیکن بیماری کا علاج نہیں ہو پاتا۔

جب صدیوں سے ایسا خوفناک جمود طاری ہو تو اس سے نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ سوال اٹھانے کا کلچر پیدا کیا جائے۔ چاہے سماج کو سوال کتنا ہی غیر معقول لگے، اس کی حوصلہ شکنی نہیں ہونی چاہیے۔ جب لاکھوں ذہن ایک کرب کی حالت میں سوال پوچھیں گے تو پھر وہ جواب بھی ملنا شروع ہو جائیں گے جو ابھی تک ہم سے پوشیدہ ہیں۔ غیر معقول اور سطحی سوال کوئی نقصان نہیں دیتے۔ وہ ایک بلبلے کی طرح چند لمحات کے لیے فضا میں ابھرتے ہیں اور پھر مٹ جاتے ہیں۔ اگر سوالات پر شرطیں عائد کی جائیں گی تو پھر وہ کلچر پیدا نہیں ہو پائے گا جس سے تخلیقی روح بیدار ہوتی ہے۔

ریاض علی خٹک

زندگی اور برداشت

ایک چیز رفتار ہوتی ہے، چیتا 70 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے لیکن سوال بنتا ہے کہ کتنا دوڑ سکتا ہے؟ تو اس رفتار پر یہ صرف 700 گز دوڑ سکتا ہے،اس سے زیادہ اس کی برداشت سے باہر ہے،اس لیے جب رفتار کی بات آتی ہے تو اہم تر چیز برداشت ہے۔

کچھ چیزوں کو اللہ رب العزت نے خصوصیات دی ہوتی ہیں۔ آپ گھوڑوں کی مثال لیں۔گھوڑے میں ایک نسل عربی کہلاتی ہے۔ بظاہر ایک جیسے گھوڑوں میں عربی گھوڑے منفرد ہوتے ہیں۔ان کے پٹھوں کے ریشے عام گھوڑوں سے الگ ہیں۔ یہ twitch fiber کہلاتے ہیں۔ یہ گھوڑوں کی دوسری نسل سے دوگنا عربی نسل میں ہوتے ہیں۔ ان کے خون کے سرخ ذرات چھوٹے لیکن زیادہ ہوتے ہیں۔جس سے فضا سے آکسیجن زیادہ لے سکتے ہیں۔ان کا چہرہ چھوٹا ناک کے نتھنے بڑے ہوتے ہیں۔ان کا دل سینہ پھیپھڑے عام گھوڑوں سے بڑے ہوتے ہیں۔ان کے جسم کی جلد پتلی ہوتی ہے۔اس لیے عربی گھوڑے میں دوسری ہر نسل کے گھوڑے سے زیادہ برداشت اور رفتار ہوتی ہے، لیکن بہت سی نسلوں سے کم طاقت ہوتی ہے۔

چیتا شکار کیلئے دوڑتا ہے۔گھوڑے کو سوار دوڑاتا ہے۔ یہ سوار ہی ہوتا ہے جو اپنے گھوڑے کی نسل و برداشت جان کر اس کے راستے و منزل طے کرتا ہے۔اس کی برداشت کیلئے آرام و خوراک کا حساب رکھتا ہے۔اس کا سوار انسان ہے۔ جسے ہر ذی روح سے زیادہ برداشت دی گئی ہے۔آج دنیا کے ہر جانور کے ساتھ طویل فاصلے کی میراتھن کرا دیں۔ فاتح انسان ہی ہوگا۔ ہاں اس انسان کو برداشت کے ساتھ شعور بھی دیا گیا ہے۔وہ شعور جو برداشت کرنا سکھاتا ہے۔ اپنی برداشت کو شعور کی طاقت دیتا ہے۔ یادرکھیں جس نے برداشت کھودی، اس نے منزل کھودی کیونکہ زندگی برداشت کا سفر ہے۔

محمد سلیم

تھوڑا سا اور

سن 1976 کے اولمپک مقابلوں کے دوران میں سو میٹر کی دوڑ کے آخری مرحلے میں کل آٹھ کھلاڑی شریک تھے۔ سونے کا تمغہ جیتنے والا کھلاڑی باقی کے آٹھ کھلاڑیوں سے صرف ایک سیکنڈ کا دسواں حصہ زیادہ تیز تھا۔ رفتار میں بہت ہی تھوڑا سا فرق مگر نتائج میں بہت بڑا فرق۔

امریکہ میں ہونے والی ایک گھڑ دوڑ میں جیتنے والے گھوڑے کو دس لاکھ ڈالر کا انعام ملا، دوسرے نمبر پر آنے والے گھوڑے کو جو جیتنے میں فقط ناک کے فرق سے رہ گیا تھا محض پچھتر ہزار ڈالر ملے۔ مسافت میں اتنا مہین سا فرق مگر نتائج میں بہت بڑا فرق۔

ایک قانون جان لیجیے کہ اگر آپ اپنی نوکری پر جانے سے ایک گھنٹہ پہلے جاگ جاتے ہیں، اور اپنی فیلڈ سے متعلقہ کوئی بھی کتاب پڑھتے ہیں تو گویا آپ ہفتے بھر میں سات گھنٹے مطالعہ کر لیں گے۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد، آپ کا علم اپنے دفتر کے تمام ساتھیوں میں زیادہ ہوگا۔ اور آپ کے ساتھی آپ سے مشورہ لیا کریں گے کیونکہ آپ ہی ان میں زیادہ تجربے والے شمار ہو رہے ہوں گے۔ محض تھوڑا سا اضافہ مگر نتائج میں بہت بڑا فرق۔

اگر آپ مسجد میں نماز سے تھوڑا سا پہلے یا اذان ہوتے ہی جانا شروع کر دیں تو آپ نماز سے پہلے پہلے کم از کم قرآن مجید سے دس صفحات پڑھ پائیں گے۔ اگر آپ ایسا دو نمازوں میں ہی کر لیں تو روزانہ بیس صفحات کی تلاوت شروع ہو جائے گی۔ اس کا مطلب تقریباً ایک سی پارہ یومیہ یا ایک سو چالیس صفحے ہفتہ وار یعنی ایک ختم قرآن ہر مہینے۔ محض تھوڑا سا اضافہ مگر نتائج میں بہت بڑا فرق۔

ایک باپ اپنے پرائمری کے طالبعلم بیٹے کے ساتھ رات کا کھانا لگتے لگتے پندرہ منٹ کے

لیے مل کر کوئی انگریزی کی کتاب پڑھتا تھا۔ اب اس کا بیٹا مڈل سکول میں ہے لیکن انگریزی کی کوئی بھی کتاب بغیر کسی مسئلے کے پڑھ لیتا ہے۔ وقت میں محض تھوڑا سا اضافہ مگر نتائج میں بہت بڑا فرق۔

خلاصہ: تھوڑے سے اضافے کا قانون اپنی زندگی کے ہر شعبے میں لاگو کر لیجیے، اپنے کام کو دیکھیے، اپنے تعلقات کو دیکھیے، اپنی صحت کو دیکھیے، اپنے بچوں کو دیکھیے، اور اپنے ہر اس کام کو دیکھیے جس میں آپ تھوڑا سا اضافہ کر سکتے ہیں اور اپنے گردونواح میں ہر اس ناطے کو دیکھیے جس میں آپ تھوڑے سے اور کا اضافہ کر کے بڑی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ زندگی میں بہت ساری ایسی چیزیں ہیں جو تھوڑے سے اور اضافے کے ساتھ بہت بڑی تبدیلی سے جڑی ہوئی ہیں۔

تھوڑا سا اور اضافے کا قانون اپنے آپ پر لاگو کرنے سے بہت ساری کامیابیاں آپ کے قدموں میں۔

یاد رکھیے کہ اس تھوڑے سے فرق کے ساتھ ہی ہرنا کامی اور ہزیمت جڑی ہوئی ہے۔ تھوڑا سا فرق اور اتنے بڑے بڑے نقصانات!! ان کا سوچیے جن کا فرق دنوں اور راتوں کا ہو!!

خدا کے امتحان میں ناکام ہونے والے
اکثر لوگ اپنا پرچہ امتحان وہاں دیتے ہیں
جہاں ان کا امتحان نہیں لیا جا رہا اور
وہاں نہیں دیتے جہاں امتحان لیا جا رہا ہے
(ابو یحییٰ)

ثمر عمیر

کتابوں کی نمائش 2018، ایکسپو سینٹر

کتابوں کی نمائش 2018 جس کا انعقاد expo center میں کیا گیا، خوش قسمتی سے مجھے وہاں میری پانچ سالہ صاحبزادی کے ساتھ جانا نصیب ہوا۔ ادارہ انذار کا سٹال ہال نمبر 2 اسٹال نمبر 16 پر مجھے کچھ وقت کھڑے ہونے کے فرائض انجام دینے تھے۔ ادارے کے سربراہ اور مصنف ابو یحییٰ کی دیگر تصانیف کے علاوہ ان کا مشہور ناول ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا تعارف کرواتے ہوئے مجھے جن باتوں کا تجربہ پیش آیا وہ کسی حد تک دلچسپ ہیں جسے میں قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گی۔

انسانوں کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے بہت سی باتیں سیکھنے اور غور کرنے کی ہوتی ہیں جس سے انسانی نفسیات کا علم ہوتا ہے، انسان کی سادگی، مروت، خوف، شخصیات کا تنوع، خوش اخلاقی، خوش مزاجی، احترام انسانیت، علم دوستی اور رب سے گہرا تعلق جیسی اعلیٰ صفات بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کتاب کی نمائش میں آنے والے لوگوں میں بزرگ، نوجوان خواتین وحضرات اور بالغ نوجوان لڑکے لڑکیاں، اسکول اور مختلف تعلیمی اداروں سے وابستہ افراد بھی ذاتی دلچسپی کی بنا پر موجود دکھائی دیے، میرا تجزیہ بزرگوں اور جوانی کی عمر سے گزر کر عمر کے آخری حصے میں قدم رکھنے والوں کے حوالے سے یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی عمر گزار لی ہے لہٰذا اصلاح نفس ان کے لیے کوئی خاص اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ یعنی کچھ مایوسی ان کے رویے سے جھلکتی نظر آئی جس کی ایک وجہ ناول کے عنوان پر غور نہ کرنا بھی تھا ''جب زندگی شروع ہوگی'' سے ان کا تاثر دنیوی زندگی کے حوالے سے بنا کیونکہ انہوں نے برملا کہا۔۔۔ارے میری تو زندگی ختم ہو رہی ہے۔۔۔ میں نے کہا یہی تو بتایا گیا ہے اس ناول میں کہ ابھی زندگی شروع ہی کہاں ہوئی ہے؟

ایک صاحب جو کہ ادھیڑ عمر تھے ،ان کو میں نے کہا کہ ابھی بھی وقت تو باقی ہے جس پر وہ مسکرا دیے۔ گہرائی سے اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ ابھی تک ہم روایتی مسلمانوں کی طرح زندگی گزارتے چلے جارہے ہیں اس لیے آخرت کے بارے میں شعوری طور پر یقین کرنا یا اس کا سوچنا ہمارے لیے انتہائی اجنبی ہے۔اس لحاظ سے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے سنجیدگی کے ساتھ سوچا جائے ،اس کی تیاری کی جائے ، یا اس کے لیے کوئی پلاننگ کی جائے ۔ یا یہ کہ ہماری موجودہ زندگی کی طرح وہ بھی زندگی ہے جس میں ہم سب نے جانا ہے۔یا یہ کہ وہ ہمیشگی کی زندگی ہے اور یہ دنیا عارضی جگہ ہے وغیرہ۔۔۔مثبت پہلو اس کا یہ ہے کہ جب ہم اس طرح کی activity سے گزرتے ہیں تو جن لوگوں تک ہم عام حالات میں کسی طرح بھی نہیں پہنچ سکتے ان کے بھی کانوں میں کچھ اس یاددہانی کی گونج بالواسطہ پہنچ جاتی ہے۔بعض لوگوں کو کتاب سے متعارف کرواتے ہوئے جیسے ہی قیامت کا ذکر آیا انہوں نے ڈر کے مارے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔سب سے اچھا تجربہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے گروپ کے ساتھ رہا ،ان کی سلیم الفطرتی اوردلچسپی قابل دید تھی ،صرف بات ان کے معیار پر سمجھانے کا ڈھنگ اوران کی زندگیوں سے متعلق کر کے اس کو بیان کرنے کی دیر ہوتی ہے۔۔۔ان کی فطری ہدایت کے نور کی تابنا کی محسوس کی جاسکتی ہے۔ البتہ رہنمائی کرنے والوں کے پاس حکمت ہونا ضروری ہے ۔ ناول کی صورت میں قیامت کو بیان کرنا ایسی ہی ایک کوشش ہے۔یہ بتانا ضروری ہے کہ الحمدللہ ایک طبقہ ان تمام تصانیف سے پہلے ہی واقف ہے اور وہ اسی لیے مزید نئی کتابیں خریدنے کے لیے تشریف لاتے رہے۔

''جب زندگی شروع ہوگی'' کا آخری حصہ **''خدا بول رہا ہے''** بھی خریداروں کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہا ،ناول کے حوالے سے تعارفی جملے بیان کرتے ہوئے یہ جملہ ان لوگوں کے لیے کسی

حد تک دلچسپی کا باعث تھا۔۔۔کہ۔۔۔modern life styleمیں جو حالات ہیں اس میں کوئی کیسے ایمان و اخلاق پر قائم رہ سکتا ہے؟ ایک جوڑا جو اسی طرح کی زندگی گزار رہا تھا وہ کیسے آخرت کے حوالے سے فکر پر آمادہ ہوا؟ یہ باتیں اس ناول میں آپ جان سکتے ہیں۔ یہ سن کر بھی کچھ نوجوان اور کچھ بڑی عمر کے لوگ جو پہلے سے کچھ زیادہ نہیں جانتے تھے ان باتوں کو سننے کے لیے رک جاتے تھے۔

''قرآن کا مطلوب انسان'' کے حوالے سے آگاہی ناول کی تفصیلات کے بعد ہمارا ہدف تھی۔۔۔الحمدللہ لوگ چاہتے ہیں کہ سمجھیں اور سیکھیں۔بعض ایسے بھی تھے جو قرآن کا ترجمہ پڑھ کر براہ راست اپنی ہدایت کا سامان کر رہے ہیں، ان کے لیے بھی اس کتاب اور کورس میں موجود تفصیلات علم میں اضافے کا باعث بنیں۔۔۔ جب دعوت کا کام اخلاص نیت اور دعوت کے شعوری جذبے کے ساتھ کیا جاتا ہے تو خود اپنے لیے ایمان کی حلاوت اور اپنی اصلاحِ نفس کا سامان بھی پیدا ہوتا ہے۔ روحانی سکون اور طمانیت حاصل ہوتی ہے جو مقصد حیات پر زندگی گزارنے (یعنی زندگی بندگی ہے) کے احساس کے ساتھ اپنے کمال کو چھوتی ہے۔اور دل سے یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش یہ زندگی ایسے کارآمد کاموں کی نذر ہو جائے۔حق زندگی اور حق بندگی ادا ہو جائے۔

دعوتی عمل کے علاوہ اس طرح کی نمائش نفیس ذوق کے حامل لوگوں سے ملاقات کے مواقع بھی پیدا کرتی ہے۔بچوں کو لے جانے کے بھی بڑے فوائد ہیں میری پانچ سالہ صاحبزادی نے پمفلٹ بانٹنے میں اس قدر دلچسپی سے حصہ لیا کہ کتابیں اور کلرنگ بک خریدنے کی خواہش پر یہ ایکٹیویٹی اس کے لیے غالب رہی۔ رائیٹر اور عظیم شخصیات سے ملاقات کا موقع بھی بچوں کی شخصیت کو بنانے میں اہم کردار کا حامل ہے۔

محمد تہامی بشر علوی

انسان کی سب سے بڑی الجھن کا حل

دنیا میں ہر انسان کو یہ الجھن درپیش ہوتی ہے کہ اسے جتنا کچھ ملا ہے، وہ اس کے لیے ناکافی ہے۔ وہ ملی ہوئی چیزوں سے پوری طرح خوش نہیں ہو پاتا۔ اسے جو جسمانی شکل وصورت ملی ہے یا جو اورنعمت بھی ملتی ہے، وہ اس سے مطمئن نہیں۔ میں نیپال کے سفر پہ تھا، دوبئ سے ایک آسٹریلین خاتون ہماری ہم سفر بنی۔ دوران سفر ان سے چند امور میں تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ میں نے اس سے اس کی زندگی کا مقصد دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ میں اس لیے جینا چاہتی ہوں تاکہ لوگوں کو مجھ سے خوشی ملے۔ وہ خاتون لیڈی ڈاکٹر تھی۔ اس نے بتایا کہ میں مریضوں کی ہیلپ کرکے، ان کی خدمت کرکے، ان کا دکھ دور کرکے بہت خوشی محسوس کرتی ہوں۔ میں ان کو خوشی پہنچاتی ہوں اور یوں ان کی خوشی واپس مجھ تک لوٹ آتی ہے۔ انھیں خوشی پہنچا کر مجھے ایک سکون ملتا ہے۔

بس یہی سکون اور یہی خوشی میری زندگی کا مقصد ہے۔ میں نے اس سے کہا: بتائیے، کیا آپ واقعی خوش ہیں؟ اس نے کہا: میرا خیال ہے کہ میں خوش ہی ہوں۔ میں نے کہا: میرا خیال ہے کہ ایسا تو ممکن ہی نہیں۔ اس نے کہا: وہ کیسے؟ میں نے اس سے پوچھا: بتائیے، آپ کو جو وجود اور جو صورت ملی ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟ کیا آپ اپنی ناک کو اسی طرح قبول کریں گی یا اگر آپ کو اپنی مرضی کی ناک رکھنے کا آپشن مل جائے تو آپ اس ناک کو بدلنا چاہیں گی یا نہیں؟ اس نے کہا کہ آپشن ملے تو بدل دوں گی۔ میں نے کہا: تو کیا آپ اپنی اس موجودہ ناک سے خوش نہیں ہیں؟ اس نے ذرا توقف کے بعد کہا کہ نہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ معاملہ صرف ناک تک ہی محدود نہیں ہے، حقیقت یہی ہے کہ دنیا میں ایک انسان کو ملنے والی

چیزوں سے کوئی انسان بھی خوش نہیں۔

ہر انسان کو موقع دیا جائے تو وہ چاہے گا کہ اس کا پورا وجود اور صورت بدل کر اس کی مرضی کے مطابق کر دی جائے۔ موجود کو ناکافی سمجھنا اور اپنے لیے اپنی مرضی کا پانے کی تمنا کرنا، یہ ہر انسان کا فطری مسئلہ ہے۔ اپنی مرضی کا یہاں کچھ بھی نہ پا سکنا، انسان کی سب سے بڑی الجھن ہے۔ وہ اس الجھن کو اسی دنیا میں آج بھی حل کرنے کی ہر ممکن سعی کر رہا ہے۔ خدا بتاتا ہے کہ اس موجود دنیا میں ایسی کسی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ کوئی کہے بھی کہ وہ موجود سے مطمئن ہے تو تھوڑی تحقیق سے معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت حال اس سے مختلف ہے۔ آپ انسانی معاملات پر غور کریں، آپ اپنے رشتہ داروں، اپنے گھر والوں میں ہی دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ آپ کے مزاج اور مرضی کے سارے افراد نہیں ہوں گے۔ یہ بھی آپ کے لیے پریشانی کی وجہ بن جاتی ہے۔ آپ کے گھر کا جو ماحول ہے، وہ بالکل آپ کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔

بعض اوقات اولاد پریشان ہوتی ہے کہ ہمارے والدین ہماری مرضی کے نہیں ہیں۔ وہ ہمارے ہر معاملے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ بعض اوقات والدین پریشان ہوتے ہیں کہ ہماری اولاد ہماری مرضی کے خلاف کچھ اور کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اس قسم کی الجھنیں ہر انسان کو درپیش ہیں اور انسان شروع ہی سے ان کا حل تلاش کرنے کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بس کسی طرح ہمیں ان مسائل کا حل مل جائے اور ہم ایسی کوئی دنیا آباد کر لیں جس میں سب کچھ ہماری مرضی کا ہو۔ جہاں ہماری صورت، ہماری صحت، ہماری صلاحیتیں، ہمارا گردوپیش اور ہمارا ماحول، یہ سب کچھ ہماری خواہشات کے مطابق ہو جائے۔ لیکن ایسا ہونے کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آ رہی۔ اور سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ انسان کو موت کا کھٹکا ہر وقت لگا رہتا ہے۔ انسان اور یہ کائنات آپس میں میچ ہی نہیں کرتے۔ اصل میں انسان کی اس الجھن کا حل انبیا علیہم

السلام کے علاوہ کسی نے پیش ہی نہیں کیا۔ انبیا علیھم السلام انسانوں کو ایک بہت اہم حقیقت سمجھاتے رہے۔

وہی حقیقت درحقیقت ان تمام الجھنوں سے، پریشانیوں سے نکلنے کے لیے ایک فارمولا ہے۔ اس کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ جو انسان اس فارمولے کو سمجھ لے گا، وہ پریشانیوں سے نجات حاصل کر لے گا۔ جو یہ نہیں سمجھے گا، وہ پھنسا رہے گا، الجھا رہے گا اور ساری زندگی اس فارمولے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بے چین، مایوس اور اداس رہے گا۔ وہ فارمولا یہ ہے کہ انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: ایک حصہ ہے مرنے سے پہلے کا اور ایک حصہ ہے مرنے کے بعد کا۔ مرنے سے پہلے جو حصہ ہے، یہ need basis life ہے، یعنی اس حصے میں وقتی نوعیت کی ضروری چیزیں ہی آپ کو ملیں گی۔ اس میں آپ کی خواہشات پوری نہیں ہوں گی۔ کسی انسان کی اس دنیا میں ساری خواہشات کبھی پوری ہوئی ہی نہیں، بلکہ یہاں تو کسی کی کوئی ایک خواہش بھی کامل طور پر پوری نہیں ہوتی۔ یہ دنیا اپنی بناوٹ میں ادھوری اور نامکمل دنیا ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی دنیا میں ہمیں کیوں لایا گیا ہے؟ جب ہماری خواہشات پوری نہیں ہورہیں، تو ہم میں یہ خواہشات رکھی ہی کیوں گئی ہیں؟ انبیا کے دیے ہوئے تصورِ حیات میں ان سوالوں کا جواب موجود ہے۔ اس تصور کی رو سے اس محدود دنیا نے ختم ہو جانا ہے اور انسان کی لامحدود خواہشات پوری کرنے کے لیے الگ کائنات تخلیق کی جائے گی جو انسان کی خواہشات کے مطابق ہوگی۔ یہاں ان خواہشات کا ہونا اس چیز کی دلیل ہے کہ جنت ہر انسان کا ایک فطری تقاضا ہے۔ ہر انسان کو اس فطری تقاضے کو پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس عارضی دنیا میں لوگوں نے اپنے آپ کو اس wish based life کے لیے منتخب کروانا ہوگا۔ ان منتخب افراد کو صالح لوگوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی جنت کے معیار پر پورے اترنے والے لوگ۔ جنت کے

معیار پر پورا اترنے کے لیے اس عارضی دنیا میں ہمیں ایک امتحان سے گزرنا ہوگا۔

یہ امتحان پوری انسانی شخصیت کا امتحان ہے جس میں ہماری فکر، علم، عمل، خیال اور اخلاق کو آزمایا جائے گا۔ اس آزمائش میں ہم سے اچھائی چاہی گئی ہے۔ اس دنیا میں مرنے سے پہلے پہلے جو لوگ اس میرٹ پر آ جائیں گے، وہ خواہ کسی بھی رنگ، نسل، خاندان سے ہوں، خواہ وہ امیر ہوں، غریب ہوں، مسکین ہوں، یا فقیر ہوں، جو بھی ہوں وہ wish based life کے لیے qualify کرلیں گے۔ وہاں پر انسان کو اپنی مرضی کی مکمل بادشاہی مل جائے گی۔ وہاں نہ کبھی موت آئے گی، نہ بیماری آئے گی۔ وہاں نہ کوئی خوف اور نہ کوئی الجھن، پریشانی۔ وہاں بس مکمل خوشی ہے اور مسلسل خوشی ہے۔

یہ ایک اہم حقیقت ہے، جو ہر وقت پیش نظر رہنا بہت ضروری ہے۔ یہ حقیقت نظروں سے ہٹتے ہی انسان جہالت اور بے چینی کی بے معنی زندگی جینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج انسانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہی یہی ہے۔ زندگی کا دوسرا حصہ اس کی نظروں سے مکمل ہٹ گیا ہے۔ مسلمانوں میں بھی دیکھیے تو آخرت کا تصور بالکل رسمی ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کی عملی زندگی میں محسوس نہیں کیا جا سکتا کہ وہ آخرت کو سامنے رکھ کر جی رہے ہیں۔ ہمیں یہ محسوس کرنے کے لیے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، ہم یہ سب اپنی زندگی میں بھی محسوس کر سکتے ہیں۔

آخرت کے حقیقی تصور سے بے خبری کے نتیجے میں ایک قسم کا رسمی سا تصور ذہنوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہاں کی کامیابی کے لیے بھی حقیقی طرز زندگی اختیار کرنے کے بجائے لوگ من چاہے حربے اختیار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت ہمارے ہاں کے مسلمانوں کا رائج تصور آخرت قرآن مجید کے دیے ہوئے حقیقی تصور کے مکمل طور پر برعکس ہے۔ اس تفصیل کا یہاں موقع نہیں، بہر حال یہ اس دور کا بڑا المیہ ہے کہ انسان، زندگی کے دوسرے

حصے کے بارے میں کوئی شخص سنجیدہ نہیں۔ عارضی زندگی میں مکمل ہوشیار لوگ بھی ابدی زندگی کے معاملے میں مکمل بدھو بنے ہوئے ہیں۔ وہ دنیا میں احمقانہ طرز عمل اختیار کرنے پر لوگوں پر ہنستے ہیں اور خود اخروی معاملے میں ان سے بھی پرلے درجے کے احمق بنے رہتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا مذہبی طبقہ بھی آخرت کے درست تصور پر قائم نہیں ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ علما امت میں دل کے مانند ہوتے ہیں، ان میں بگاڑ آ جائے تو امت کے پورے وجود میں بگاڑ آ جاتا ہے۔اس طبقے میں آخرت کا تصور بگڑا تو انھوں نے لوگوں کا تصور بگاڑ دیا۔لوگوں کی حالت یہ ہے کہ دینی امور میں محلے کے مولوی صاحب پر مکمل قناعت فرما رہے ہوتے ہیں، غور وفکر کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور دنیا جہان کی من گھڑت چیزوں پر ایمان لانے کو بے تاب بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ کو یقین نہ آئے تو خود ہی آزمائش کے لیے کوئی من گھڑت افسانہ سناڈالیے، پھر دیکھیے اس پر یقین کرنے کو بے شمار لوگ بہ آسانی میسر ہو جائیں گے۔ یوں اوٹ پٹانگ چیزیں ماننے کو بے تاب قوم ماننے سے پہلے سوچنے کا وقفہ ضروری نہیں سمجھتی۔

بات ہو رہی تھی زندگی کے دو حصوں کے تصور پر۔اس تصور کو ٹھیک طرح سمجھنا، زندگی کی نعمت سے ٹھیک طرح فائدہ اٹھانے کے لیے بہت ضروری ہے، ورنہ ایک خوب صورت اور مطمئن زندگی جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ زندگی کے اس تصور کو سمجھنے کے بعد ہی کوئی زندگی کا عارضی حصہ آزمائش سمجھ کر گزار سکتا ہے۔ وہ یہاں کی محرومی اور عطا کو آزمائش وامتحان کے زاویے سے ہی دیکھے گا۔ وہ ملنے پر مغرور اور چھننے پر مایوس نہیں ہوگا۔

یہاں کسی کی آنکھیں اس کی مرضی کی نہیں، کسی کی شکل اس کی پسند کی نہیں۔ اگر وہ مومن ہے تو وہ مایوس نہیں ہوگا۔ اسے معلوم ہے کہ یہ یہاں اس کی مرضی کا اسے نہیں دیا گیا۔ وہ یہ جانتا ہے

کہ اسے یہاں جو کچھ ملا ہے، اس کی بنیاد پر سب کچھ اپنی مرضی کا پانے کے لیے کوالیفائی کر سکتا ہے۔ وہ جو جیسا ملا ہے، اس پر شکر کرے گا اور اپنی مرضی کا پانے کے لیے صبر کرے گا۔ اس صبر اور شکر کے ساتھ وہ اپنی زندگی کو پاکیزہ بنا کر جنت کا انعام پا لے گا۔ آخرت کے یقینی اور حقیقی تصور کے دل میں راسخ ہو جانے کے بعد پوری زندگی کی ترتیب بدل جاتی ہے۔ سوچ، فکر، عمل اور اخلاق، سب کچھ مناسب جگہ پر آ جاتا ہے۔ یہ حقیقت فراموش کر کے لوگ دولت اور اسباب کی نہ ختم ہونے والی بھوک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس طرح انھیں اپنی مرضی کی زندگی جینے کا موقع مل جائے گا۔ کروڑوں کمانے والوں سے معلوم کیجیے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی کوئی ایک مرضی بھی ان کی مرضی کے مطابق پوری نہیں ہوئی۔ آپ کروڑوں روپے کیا ساری دنیا کے اسباب اور دولت جمع کر لیں، تب بھی آپ کی خواہشات کے مقابلہ میں ایک تنکے جتنی خواہش بھی پوری نہیں ہوئی ہوگی۔

یہ اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے کہ اس آزمائش کی زندگی میں ایسا ہو جانا ناممکنات میں سے ہے۔ یہاں جو ممکن ہے، وہ بس یہ ہے کہ یہاں ہم اپنے آپ کو اس قابل بنا لیں کہ زندگی کے دوسرے حصے میں خواہشات والی زندگی جینے کا موقع ہمیں مل جائے۔ ویسی زندگی کے حصول کی اس امتحان کی عارضی زندگی میں کوشش ایک کھلی حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ ایسا احمق اس احمق سے بھی بڑا احمق ہے جو کیکر کے درخت پر آم کا پھل لگنے کا انتظار کر رہا ہو۔

ترکی کا سفر نامہ (61)

موجودہ اہل تصوف کے ہاں مرشد کی ذہنی غلامی کی یہ روایت دین اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ آج کے دور کا بڑے سے بڑا ولی بھی سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بڑا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ ان کے ہاں یہ عام معاملہ تھا کہ اگر کسی شخص کو ان سے کسی بات پر اختلاف ہوتا تو بھرے مجمع میں ان سے اس اختلاف کا اظہار کر کے ان سے جواب طلبی کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس صوفیاء کے ہاں اختلاف رائے تو درکنار، اس بارے میں سوچنا بھی جرم ہے۔

موجودہ اہل تصوف اور اسلام کے درمیان چوتھا بڑا فرق "قبر پرستی" ہے۔ صوفیائی اکثریت بزرگان دین کے مزارات پر چلہ کشی کرتی ہے اور قبروں سے روحانی فیض حاصل کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا مزاج اس سے بالکل مختلف تھا۔ اگر قبروں سے روحانی فیوض و برکات حاصل کیے جا سکیں تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر انور سے بڑھ کر کون سی قبر ہو گی۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مرض وفات میں ارشاد فرمایا: "اللہ نے ان یہودیوں اور عیسائیوں پر لعنت فرمائی جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو نماز کی جگہ بنا لیا۔" آپ فرماتی ہیں: "اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ حضور کی قبر کو بھی لوگ نماز کی جگہ بنا لیں گے تو آپ کی قبر مبارک کھلی جگہ پر ہوتی۔" (بخاری، کتاب الجنائز)

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں کو پختہ بنانے، ان پر لکھنے، ان پر عمارت تعمیر کرنے اور ان پر پاؤں رکھ کر چلنے سے منع فرمایا۔ (ترمذی، کتاب الجنائز)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے کثیر تعداد میں صحابہ 90 سال تک موجود رہے ہیں۔ ان کے حالات زندگی پر دوسری صدی ہجری ہی میں طبقات ابن سعد جیسی کتاب لکھی گئی ہے جس میں ہزاروں صحابہ کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی گیارہ جلدیں ہیں جن میں ہر جلد 600 صفحات کے قریب ہے۔ اس کے علاوہ تیسری صدی میں امام بخاری کے استاذ کے استاذ ابن ابی شیبہ نے صحابہ کرام کے اقوال و اعمال کو اپنی مشہور کتاب ''المصنف'' میں جمع کیا ہے۔ اس کتاب کی 26 جلدیں ہیں جن میں سے ہر جلد 700 صفحات کے آس پاس ہے۔ ان تمام کتب میں کوئی ایک بھی ایسی روایت نہیں ملتی کہ کسی صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر انور پر آ کر چلے اور مراقبے کیے ہوں اور اس طریقے سے روحانی سفر طے کیے ہوں۔ اگر آپ کی قبر مبارک کا یہ معاملہ ہے تو پھر بعد کے کسی بزرگ کی قبر سے فیضان کا حصول کیسے ممکن ہے؟

موجودہ اہل تصوف اور اسلام کے درمیان پانچواں بڑا فرق ''ترک دنیا'' کا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح الفاظ میں ترک دنیا سے منع فرمایا ہے۔ اس معاملے میں مسلمانوں کے ارباب تصوف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک بہر حال ترک دنیا افضل ہے۔ یعنی کھانے پینے کی لذتوں، ازدواجی زندگی کی مسرتوں اور دنیا کے دیگر معاملات سے لطف اندوز ہونے کے بجائے خود کو خدا کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔

اہل تصوف کا تیسرا گروہ جس میں شامل لوگ قرآن و حدیث پڑھتے ہیں، وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اسلام ترک دنیا کی اجازت نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بڑے طبقے میں ترک دنیا کو ترک کر دیا گیا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر دنیا رب کی یاد سے غافل نہ کرے

تو پھر دنیاوی زندگی کے مزے لوٹنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

اسلام اور مروجہ تصوف میں چھٹا بڑا تضاد وہ اذکار، اوراد، چلے اور مراقبے ہیں جن کا کوئی ذکر قرآن مجید یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت میں نہیں ملتا۔ بغیر سوچے سمجھے قرآن ختم کرنے پر زور، لاکھوں کی تعداد میں آیات کا ورد، سانس اوپر نیچے کرنے کے ذریعے ذکر، جنگلوں اور غاروں میں چالیس چالیس دن کے مراقبے، ان سب کے پورے مدون قوانین ہیں جو ارباب تصوف نے تخلیق کر لیے ہیں۔ ان سب کا کوئی ذکر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات میں نہیں ملتا۔

اسلام اور تصوف میں یہ وہ تضادات ہیں جن کا تصوف سے وابستگی کے دور میں میں نے بذات خود مشاہدہ کیا ہے۔ میں نے بہت سے صوفی بزرگوں کی خدمت میں جب ان تضادات کی نشاندہی کی تو مجھے بس خاموش رہنے کا حکم ہوا۔ کوئی صوفی بزرگ اس کا تسلی بخش جواب پیش نہ کر سکا۔ اگر کوئی صاحب ان تضادات کو حل کرنے کی کوشش کریں تو مجھے خوشی ہوگی۔ یہ بات درست ہے کہ سب کے سب صوفی علماء اوپر بیان کردہ تضادات میں سے ہر ایک کا شکار نہیں ہیں۔ بہت سے ایسے صوفی علماء جنہوں نے قرآن وسنت کا مطالعہ کیا ہے، بھی ان بدعات کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

اس قوم کی اصلاح کیسے ہو
جس کے ہر فرد کے لیے اصلاح کا مطلب
دوسروں کی اصلاح ہو (ابویحییٰ)

پروین سلطانہ حنا

تو یہ کیسی محبت ہے؟

محبت ہے تمہیں ہم سے

چلو یہ مان لیتے ہیں

مگر کیسی محبت ہے؟

جو آنکھوں سے جھلکتی ہے!

نہ لہجے سے ٹپکتی ہے!

نہ کوئی رابطہ قلبی

نہ کوئی راستہ ایسا

جو دل کی رہگزر سے آسماں کی رفعتوں کی

سمت جاتا ہے

محبت عکس ہے نورِ خدا کا جو اندھیرے جگمگاتا ہے

اک ایسا گل ہے جو لمسِ وفا سے مسکراتا ہے

ہمیں ایثار والفت کے قرینے ہی سکھاتا ہے

سو جس دل میں محبت ہو!

وہاں نفرت کے خاروں کا

زرا سا شائبہ تک بھی نہیں ہوتا

جہاں پھولوں کی بارش ہو

وہاں کانٹوں کا کوئی دور تک جادہ نہیں ہوتا

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ماہنامہ

اِنذار

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

کراچی کے لیے 500، بیرون کراچی کے لیے 400 روپے کا منی آرڈر ہمارے پتے پر ارسال کیجیے......یا
ایک پے آرڈر / بینک ڈرافٹ بنام "ماہنامہ انذار" بینک الفلاح لمیٹڈ (صدر برانچ)
اکاؤنٹ نمبر 0171-1003-729378 کے نام بھجوائیے
رسالہ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے
2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوائیے
3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

ایجنسی لینے کا طریقہ کار:

ایجنسی کے لیے ہر ماہ کم از کم پانچ رسالے لینا ضروری ہے
ایجنسی کا ڈسکاؤنٹ **20** فیصد ہے
ایجنسی لینے کے لیے اوپر دیئے گئے پتے پر رابطہ کیا جاسکتا ہے

Monthly
INZAAR

FEB 2019
Vol. 07, No. 02
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,

25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi